

۱۹۲۷

درادن
۱۳۶

1523
8

مع مقدمه

CHAND

جس میں میر کے حالات اور کلام کی خصوصیات پر بحث کی گئی ہے

1987

1985
میرتب

مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے (علیگ)

معتد انجمن ترقی اردو

سنہ ۱۹۲۶ ع

جناب مرتب کی نظر ثانی اور ترمیم کے بعد

انجمنی اردو پریس اردو باغ اورنگ آباد (دکن)

میں بار سوم طبع ہوا

(تعداد طبع ۱۰۰۰)

سودا :-

میر

مقدمه

غزلیات و قطعه

فردیات

رباعیات

مستزاد هند

مخمسات

(۱) درت

(۲) شهر

مثنویات

(۱) جهوه

(۲) گهر

(۳) در

(۴) جوش

(۵) در

(۶) مناجا

(۷) درت

(۸) خواب

۱۷۳۵۱.	
۲۵۱ ج	
۵۷۵	

۶۰

سودا : — سرخ سودا کج صلب با سیم
 خادم ادب یولے ریں راجہ سنگی

سر دے میر کے آہستہ نولے
 ابھی ٹٹک روتے روتے سو گئے
 میر
 فرست مضامین

صفحہ	مضمون
الف	مقدمہ
۱	غزلیات و قطعات
۱۵۲	فردیات
۱۵۲	رباعیات
۱۵۸	مستزاد ہندی
۱۵۹	مختصات
۱۵۹	(۱) در شہر کاما
۱۶۱	(۲) شہر آشوب
۱۶۵	مثنویات
۱۶۵	(۱) جہوت
۱۶۷	(۲) گھر کا حال
۱۷۵	(۳) در ہجو خانہ خود
۱۷۹	(۴) جوش عشق
۱۸۴	(۵) در بیان دنیہ
۱۸۸	(۶) مناجات
۱۸۹	(۷) در تعریف عشق
۱۹۱	(۸) خواب دل

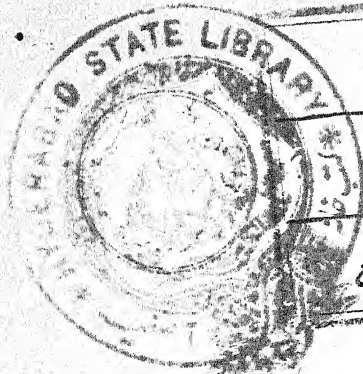
Checked
 1987

جہاں
قیامت

میر تقی
رشوق سے پرزہ
اگر دنیا کے ا
کانام ہمیشہ
داخل کر فاہر
طبع کی وجہ
تخصیص سنہ
سے ہیں جو
اپنے
ہیں
قیامت
ہو کہ
اس وقت

سیر صا

کھا ہے:
شاہجہ



مقلد

جہاں سے دیکھئے یک شعر شور انگیز نکلے ہے

قیامت کا سا ہنگامہ ہے ہرجا میرے دیواں میں

میر تقی (میر) سرتاج شعراے اردو ہیں، اُن کا کلام اُسی ذوق و شوق سے پڑھا جائے گا، جیسے (سعدی) کا کلام فارسی زبان میں۔ اگر دنیا کے ایسے شاعروں کی ایک فہرست تیار کی جائے جن کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا تو (میر) کا نام اس فہرست میں ضرور داخل کرنا ہوگا۔ یہ اُن لوگوں میں نہیں ہیں جنہوں نے سوز و غم طبع کی وجہ سے، یا اپنا دل بہلانے کی خاطر، یا دوسروں سے تحسین سننے کے لئے شعر کہے ہیں، بلکہ یہ اُن لوگوں میں سے ہیں جو ہمہ تن شعر میں توبے ہوئے تھے اور جنہوں نے اپنے کمال سے اردو کی فصاحت کو چمکا یا اور زبان کو زندہ دیا۔ شاعری میر صاحب کی زندگی کا جز تھی گویا فطرت نے ہمیں اسی سانچے میں ڈھالا تھا۔ اُن کا احسان اردو زبان پر قائم رہا، اور اُن کے کلام کا لطف کسی زمانے میں کم نہ ہو گا، کیوں کہ اس میں وہ عالم گیر حسن ہے جو کسی خاص وقت یا مقام سے مخصوص نہیں۔

جانے کا نہیں شور سخن کا سرے ہرگز

تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

میر صاحب جیسا کہ خود انہوں نے اپنے تذکرے ”نکات الشعرا“ میں لکھا ہے: ”مطوئن اکبر آباد است“ بہ سبب گردش لیل و نہار از چلندے در شاہجہاں آباد است۔ علی ابراہیم کے تذکرہ گلزار ابراہیم

میں جس کا ترجمہ میرزا علی (لطاف) نے (گلشن ہند) کے نام سے مسٹر جان گلگرسٹ کی فرمائش سے (سنہ ۱۸۰۱ء سنہ ۱۲۲۵ھ) اردو میں کیا، یہ لکھا ہے کہ ”میر تخلص، نام فاسی اُس نگین خاتم سخن آفرینی کا میر معہد نقی ہے متوطن اکبر آباد کے۔ سراج الدین علی خاں (آرزو) تخلص، آپ کے کچھہ وشتہ داروں میں دور کے تھے ابتدائے سن شہر سے پرورش اُنہوں نے دار الخلافہ شاہجہاں آباد میں پائی ہے اور خان مذکور کی صحبت سے نظم ریختہ کی کیفیت، باریکیوں کے ساتھ اُتھائی ہے۔“ غرض یہ کہ اگرچہ میر صاحب اکبر آباد میں پیدا ہوئے اور اُن کے بچپن کا زمانہ بھی وہیں گزرا، لیکن بعد میں وہ دلی میں چلے آئے اور دلی ہی کو اپنا وطن بنا لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کو دلی سے نہیں بلکہ دلی کو اُن کے قوطن سے فخر ہے۔ پھر وہ دلی ہی کے ہو گئے اور دلی ہی کے کہلائے اور اُن کی زبان بھی، جو اُس زمانے میں سایۂ اقتدار اور شرافت کی ایک علامت سمجھی جاتی تھی، دلی ہی کی تھی۔

میر صاحب کے بزرگ اپنے قبیلے کے ساتھ حجاز سے سرحد دکن میں پہنچے اور وہاں سے احمد آباد گجرات میں وارد ہوئے۔ مگر اُن کے جد کلاں نے اکبر آباد میں قوطن اختیار کیا۔ میر صاحب کے والد میر علی متقی ایک متوکل گوشہ نشین درویش تھے اور ادنیٰ اعلیٰ سب اُن کی بڑی عزت کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے دو شاہیاں کی تھیں۔ پہلی بیوی سراج الدین علی خاں آرزو کی بہن تھیں۔ دوسری بیوی بطن سے میر صاحب (میر تقی) تھے۔ اولاد دونوں بیویوں سے ہوئی۔ اس رشتے سے سراج الدین علی خاں آرزو میر صاحب کے ماموں ہوئے۔ اگرچہ تذکرۂ گلزار ابراہیمی (گلشن ہند) نیز دوسرے تذکروں میں اور خود میر صاحب نے اپنے تذکرۂ شعراے اُردو میں خان آرزو کو اپنا اُستاد اور پیر مرشد لکھا ہے

لیکن حقیقت حالِ ذکرِ میرؒ سے معلوم ہوتی ہے، جو یہ ہے:

میر صاحب والد کی وفات کے بعد ہی کوئی گیارہ سال نے سن میں دلی آگئے تھے اور نواب صہبام الدولہ امیرالامرا نے جو اُن کے والد سے ارادت رکھتے تھے، میر صاحب کا اپنی سرکار سے ایک روپیہ روزانہ مقرر کر دیا۔ نواب صاحب فادر شاہ کی جنگ سنہ ۱۱۵۱ھ میں مارے گئے اور میر صاحب کا روزانہ بند ہو گیا۔ اس وجہ سے اُنہیں پھر دہلی آنا پڑا۔ اس وقت اُن کی عمر کوئی پندرہ برس ہوئی۔ لکھتے ہیں کہ: ”جو لوگ درویش والد کی زندگی میں میری خاک پا کر سربس سمجھ کر آنکھوں میں لگاتے تھے، اب اُنہوں نے یکبارگی مجھ سے آنکھیں چرائیں۔ ناچار پھر دہلی گیا اور اپنے بڑے بھائی کے ساموں سراج الدین علی خاں آرزو کا منت پذیر ہوا۔ یعنی کچھ دن اُن کے پاس رہا اور شہر کے بعض صاحبوں سے چند کتابیں پڑھیں۔ جب میں کسی قابل ہوا تو بھائی صاحب کا خط پہنچا کہ میر محمد تقی فتنہ روزگار ہے۔ ہو گز اُس کی تربیت میں سعی نہ کی جائے۔ وہ عزیز (سراج الدین علی خاں) واقعی دنیا دار شخص تھا، اپنے بیانجے کے لکھنے پر میرے در پے ہو گیا۔ جب کبھی ملاقات ہوتی تو بلا وجہ برا بھلا کہنا شروع کر دیتے اور طرح طرح سے تکلیف پہنچانے کی کوشش کرتے۔ میرے ساتھ اُن کا سلوک ایسا تھا جیسے کسی دشمن سے ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ”اگر اُن کی دشمنی کی تفصیل کروں تو ایک دفتر ہو جائے۔“ غرض اس سے میر صاحب کو اس قدر رنج اور اس رنج و غم میں اُن کی حالت جنون کی سی ہو گئی تھی۔

* یہ کتاب میر صاحب نے اپنے حالات میں لکھی ہے۔ اس پر منسل تبصرہ گذشتہ اپریل کے رسالہ اردو میں ہو چکا ہے۔ اب یہ کتاب انجمن کی طرف سے شائع کی گئی ہے۔

اس بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب اور خان
 آرزو کے تعلقات بے حد ناگوار اور تلخ تھے اُن کی تربیت اور
 شاگردی کی روایت فسانے سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔
 ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ”فکات الشعراء“ ”ذکر میر“ سے بہت بعد لکھی
 گئی ہے۔ ”ذکر میر“ لکھتے وقت وہ تمام حالات تازہ تھے، دل پر
 صدمہ اور عالم پریشانی کا تھا، جو کچھ گزرا تھا من و عن
 سب لکھ ڈالا۔ بعد میں جب ایک مدت گزر گئی، پریشان
 حالی بھی رفع ہو گئی تو اس صدمے کا اثر بھی خود بخود
 کم ہو گیا ایسی حالت میں اُن ناگوار واقعات کا دہرانا مناسب
 نہ سمجھا اور خروش اسلوبی سے اُن پر پردہ تال دیا۔ میر صاحب
 اپنی تعلیم اور شعر گوئی کی ابتدا کے متعلق خود تحریر
 فرماتے ہیں کہ ”میر جعفر فاسی ایک صاحب سے اتفاقاً ملاقات
 ہو گئی اور اُنہوں نے بڑی عنایت اور دل سوزی سے مجھے
 پڑھانا شروع کیا۔ اچانک ایک روز اُن کے وطن عظیم آباد سے
 خط آیا اور وہ ادھر چلے گئے۔ کچھ دنوں بعد سعادت علی
 سے جو امروہے کے سید تھے، ملاقات ہو گئی۔ اُنہوں نے
 مجھے ریختے میں شعر سوزوں کرنے کی ترغیب دی۔ میں نے
 جان توڑ کے محنت کی اور ایسی مشق بہم پہنچائی کہ میں
 شہر کے سوزوں گویوں میں مستند سمجھا جانے لگا اور میرے
 شعر سارے شہر میں مشہور ہو گئے اور چھوٹے بڑے سب شوق
 سے پڑھتے تھے۔ ممکن ہے کہ میر صاحب نے خان آرزو کی
 صحبت سے بھی کچھ فیض پایا ہو، مگر اُن کے اور خان آرزو
 کے ذوق میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ میر صاحب فطرتی طور
 پر شاعر واقع ہوئے تھے اور ذوق شعر اُن کی طبیعت میں
 کوٹ کوٹ کر بھرا تھا، وہ کسی کی صحبت یا شاگردی سے
 بالکل مستغنی معلوم ہوتے ہیں۔

میر صاحب اس زمانے میں بہت پریشان رہے۔ کچھ دن
 رعایت خان (عظیم الدہ خان کے بیٹے اور اعتماد الدولہ قہر الدین

خاں کے فوائے) کی مصاحبت اور رفاقت میں گذری۔ اس کے بعد نواب بہادر کی سرکار سے تعلق ہو گیا۔ نواب بہادر محمد شاہ بادشاہ کا خواجہ سرا تھا اور بادشاہ کی وفات کے بعد احمد شاہ کے زمانے میں سلطنت میں اسے بڑا دخل ہو گیا تھا۔ جب نواب بہادر دغا سے قتل کر دیے گئے تو میر صاحب بقی بے کار ہو گئے۔ اس کے بعد وزیر کے دیوان مہنراہن نے بڑے اشتیاق سے بلا بھیجا اور اُس وقت سے اُن کی سرکار کے متوسل ہو گئے، مگر چند ہی ماہ میں یہاں کا رنگ بدل گیا۔ چند روز گوشہ نشین رہنا پڑا۔ دو تین ماہ بعد راجہ جنگل کشور جو محمد شاہ کے عہد میں دیوان بنگالہ تھے، میر صاحب کو گھر سے اُٹھا کر لے گئے۔ جب راجہ مذکور بھی زمانے کے ہاتھوں لاپتار ہو گئے، تو اُنہوں نے اپنی عنایت سے میر صاحب کی تقریب راجہ ناگر مل سے کراہی جو اُس وقت نائب وزیر اور عہدۂ الملک اور مہاراجہ کے خطاب سے ممتاز تھے۔ یہ تمام امور میر صاحب سے بڑی سہربانی اور عنایت سے پیش آتے اور اُن کی بڑی عزت و حرست کرتے تھے۔ راجہ ناگر مل کی رفاقت میں میر صاحب بہت دنوں تک رہے، اکثر مقامات میں راجہ کے ساتھ جانا پڑا اور بعض معرکے بھی دیکھے اور راجہ کی بدولت دوبار اکبر آباد کی زیارت بھی نصیب ہوئی۔ لیکن ایک ایسا واقعہ پیش آگیا کہ میر صاحب کو راجہ کی رفاقت چھوڑنی پڑی۔ جس زمانے میں جاتوں نے بڑا فساد مچا رکھا تھا، راجہ بھی پریشان تھے۔ اس نے میر صاحب کو شاہی کیمپ میں جو اُس وقت فرخ آباد میں سایہ فگن تھا، حسام الدین کے پاس بھیجا، جسے بادشاہ کے مزاج میں بہت دخل تھا۔ میر صاحب گئے اور تمام عہد و پیمان گئے۔ لیکن یہاں راجہ کا چھوٹا بیٹا میر صاحب سے خوش نہ تھا، اس لئے کہ اُن سے راجہ کے بڑے بیٹے سے بہت ربط ضبط تھا۔ اُس نے برخلاف باپ کو یہ سمجھایا کہ دکنیوں کے پاس جانا بہتر ہے۔ چنانچہ راجہ بادشاہ کے لشکر میں

نہ گئے اور شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس میں میر صاحب کی بہت سبکی ہوئی، وہ دھلی پہنچ کر راجہ سے علیحدہ ہو گئے۔ اس کے بعد ہی کا زمانہ ہے جب کہ میر صاحب لکھتے ہیں:-
 ”فقیر ان ایام میں خافہ نشین تھا۔ بادشاہ اکثر طالب فرماتے تھے مگر میں کبھی نہیں گیا۔ ابوالقاسم خان پسر ابوالبرکات خان صوبہ دار کشمیر اور عبدالاحد خان کا (جو اس وقت بادشاہ کی ناک کا بال تھا) بھائی میرے ساتھ بہت سلوک کرتا تھا، میں بھی کبھی کبھی اُس کی ملاقات کو جاتا تھا اور بادشاہ بھی کبھی کبھی کچھ بھیج دیتے تھے۔“

میر صاحب کی زندگی مصائب و آلام کا ایک سلسلہ تھی جس کا تار بچپن سے لے کر لکھنؤ جانے تک کبھی نہ ٹوٹا۔ لڑکپن ہی میں باپ کا سایہ سر سے اُتھ گیا۔ سید اسان اللہ جو اُن کے والد کے نہایت عزیز مرید تھے اور میر صاحب انہیں اپنی کتاب میں ہر جگہ عم بزرگوار لکھتے ہیں اور جو انہیں باپ سے کم عزیز نہ تھے، وہ پہلے ہی دنیا سے کوچ کر گئے تھے۔ باپ کے مرنے پر بھائی اور عزیز و اقارب نے بہت بے مروتی کی۔ دس گیارہ سال کے سن میں بسر اوقات کی فکر دامن گیر ہوئی۔ اس سے ظاہر ہے کہ اُس وقت اُن کے دل و دماغ میں کیا کیفیت ہوگی۔ جب آگرہ اور اس کے گرد و نواح میں کوئی صورت نہ نکلی تو وہ فا چار دلی پہنچے۔

اُس وقت کی دلی تاریخ میں خاص حیثیت رکھتی ہے۔ وہ ہندوستان کی جان اور سلطنت مغلیہ کی راج دھانی تھی مگر ہر طرف سے آفات کا نشانہ تھی۔ اُس کی حالت اُس عورت کی سی تھی جو بیوہ تو نہیں پر بیواؤں سے کہیں دکھیا رہی ہے۔ ابوالعزم تیبور اور بابر کی اولاد اُن کے مشہور آفات تخت پر بے جان تصویر کی طرح دھری تھی۔ اقبال جواب دے چکا تھا، ادبار و انعطاف کے سامان ہو چکے تھے اور سیاہ رو زوال گرد و پیش منڈلا رہا تھا۔ بادشاہ دستِ زگر

کو غنیمت سمجھو اور اپنے تمکین پہنچانے کی کوشش کرو۔۔۔ جب دن رات یہی صداقیاں کان میں پڑتی رہیں تو وہ بچہ بڑا ہو کر درویش نہیں تو درمیش منش ضرور ہو کر رہیگا۔ وہ اپنے والد کے متعلق لکھتے ہیں :- جوان صالح اور عاشق پیشہ تھے، دل میں گومی اور سرسبز رکھتے تھے۔ اخلاق سنجیدہ اور اوصاف حمیدہ رکھتے تھے۔ استقامت ایسی تھی کہ شاید کسی میں ہو۔ طبعش مشکل پسند، جانش درد مند، مڑگان نم، حال درہم۔۔۔ یہی اوصاف ارثاً میر صاحب کو بھی ملے۔ اس پر لوکین میں یتیم ہر گئے۔ ایک تو یتیمی کا صدمہ دوسرے عزیز اقارب کی طوطا چشمی، زمانے کی بے مروتی، بے سرو سامانی، یہ ایسی حالتیں نہ تھیں کہ اُن کے دل پر اثر نہ کرتیں۔ پھر وہ ایسے زمانے میں پیدا ہوئے جب کہ مسلمانوں کے اقبال کا ستارہ گہنا رہا تھا اور ہر طرف مایوسی و نا کامی نظر آتی تھی اور اُن حیرت انگیز اور زہرہ گداز واقعات اور انقلابات کو دیکھا اور بڑتا جو چند خاندانوں اور شہروں کا نہیں ملکوں اور قوموں کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ ممکن نہ تھا کہ میر صاحب کی سی اثر قبول طبیعت اُن حالات سے متاثر نہ ہر تی۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ اُن کے کلام کی فصاحت و شستگی سے خاص لطف حاصل ہوتا ہے مگر پڑھنے والے کے دل پر مایوسانہ اثر پیدا گئے بغیر نہیں رہتا۔ شگفتگی اور زندہ دلی میر صاحب کی تقدیر میں نہیں تھی وہ سراپا یاس و حرماں تھے اور یہی حال اُن کے کلام کا ہے گویا اُن کا کلام اُن کی طبیعت و سیرت کی ہو بہو تصویر ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ وہ اصلیت و حقیقت سے خالی نہیں۔

یہ رائے قیاسی یا فرضی نہیں۔ ”ذکر میر“ پڑھنے کے بعد اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ اُن کا ہر شعر اُن کے درد دل کی تصویر ہے۔ غزلوں سے صرف اُن کی طبیعت کا رنگ معلوم ہوتا ہے، یہ معلوم ہونا دشوار ہے کہ کونسی غزل کس وقت

اور کس حالت میں لکھی گئی۔ لیکن بعض واقعات جو ضمناً آگئے ہیں، اُن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب کی شاعری کا بہت سا حصہ آپ بیتی اور اپنے دل کی کیفیت ہے۔ مثلاً خان آرزو کی بے پروئی اور دل آزار سلوک اور اپنی بے نوائی اور بے بسی کا اُن کے قلب پر بڑا صدمہ تھا اور وہ بہت ہی شکستہ دل اور دل گرفتہ رہتے تھے۔ اسی غم و غصے میں اُن پر ایک جنون کی سی حالت طاری ہوگئی اور انہیں چاند میں ایک عجیب صورت نظر آنے لگی جس سے اُن کی وحشت اور دیوانگی اور بڑھ گئی۔ اس حالت کو ہم انہیں کے الفاظ میں نقل کرتے ہیں۔

”در شب ماه پیکرے خوش صورت با کمال خربی از جرم
 قہر انداز طرف من می کرد و موجب بے خودی می شد۔ بہر
 طرف کہ چشم می افتاد برآں رشک پری می افتاد، بہر جا کہ
 نگاہ می کردم تماشاے آن غیبت دور می کردم۔ درو بام و صحن
 خانه من ورق تصویر شدہ بود، یعنی از حیرت افزائی از
 شش جہت رو می نمود۔ گاہے چوں ماه چہار دہ مقابل گاہے
 سیر گاہ او منزل دل۔ اگر نظر بر گل مہتاب می افتاد، آتشے
 در جان بے تاب می افتاد۔ ہر شب باو صحبت، ہر صبح بے او
 وحشت۔ دمے کہ سفیدہ صبح می دید، از دل گرم آہ سرد
 می کشید، یعنی آہ می کرد و انداز ماه می کرد۔ تمام روز
 جنوں می کردم، دل در یاد او خوں می کردم۔ کف بر لب
 چوں دیوانہ و مست، پارہ ہائے سنگ در دست، من افتاد
 و خیزان، مردم از من گریزاں۔ تا چار ماه آن گل شب افروز
 رنگ تازہ می ریخت و از فتنہ خرامی ہا قیامت می انگیخت۔
 ناگاہ موسم گل رسید، داغ سودا سیاہ گردید، یعنی چوں
 پریدار شدم مطلق از کار شدم۔ صورت آن شکل و ہمیں در نظر،
 خیال مشکینش در سر۔ شایستہ کفارہ گیر شدم، زندانی و
 زنجیری شدم۔“

اب اس کے بعد میر صاحب کی مثنوی ”خواب و خیال“ پڑھئے۔ اس قلبی واردات کی تصویر اور اس خواب کی تعبیر صاف نظر آتی ہے۔ یہ محض خواب و خیال ہی نہیں بلکہ ایک واقعہ تھا جو اُن کے مایوس اور حزیں دل پر گزرا تھا۔

یہاں جب جاتوں کی سرکشی اور فتنہ پردازی سے تنگ آکر راجہ ناگر مل بیس ہزار گھروں سمیت جن میں زیادہ تر اُنہیں کے وابستہ تھے، اپنا عزیز مقام چھوڑ کر کاماں جاتے ہیں (میر صاحب بھی اس سفر میں راجہ صاحب کے ہمراہ تھے) تو میر صاحب نے ایک شخص لکھا ہے جس میں اپنی پریشان حالی اور اُس بڑے وقت کا رونا رونا ہے۔ اسی قسم کی اور نظمیں بھی ہیں (مثلاً اپنے گھر کا حال وغیرہ) جن میں اپنی بیٹا بیان کی ہے۔ اگرچہ یہ وقتی حالات اور ایک شخص واحد کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن سچا شاعر ان کو اس انداز اور خوبی سے بیان کر جاتا ہے کہ ہر شخص لطف حاصل کر سکتا ہے۔ وہ مر جاتا ہے مگر یہ چھوٹے چھوٹے بے حقیقت واقعات اس کے لطف بیان کی بدولت ہمیشہ کے لئے زندہ رہ جاتے ہیں۔

اُن کا کلام دور از کار استعارات، بعید از قیاس مبالغے اور عادت امور سے پاک ہے، بھونڈے اور بے جا تکلف و تصنع اور فضول لفاظی کا قلم نہیں، وہ قلبی واردات اور کیفیات کو نہایت سادہ، شستہ اور صاف زبان میں ایسے دلکش اسلوب سے بیان کرتے ہیں کہ جو بات وہ کہنی چاہتے ہیں وہ دل میں اُتر جاتی ہے۔ غرض یہ کہ اُن کا کلام بے لحاظ فصاحت و روانی سہل مہتمن ہے اور سہل مہتمن کلام کا تعزیه کر کے الگ الگ اُس کی خوبیوں کا گنوارا نا ممکن ہے۔ کیونکہ اس سے کلام کی اصلی خوبی کا کامل اندازہ تو ہوتا نہیں البتہ اس کی نسبت غلط فہمی پیدا کر دینے کا اندیشہ ضرور ہوتا ہے۔

شاعر کے کلام کا ایک بڑا معیار اُس کلام کی تاثیر ہے اگر

اُس معیار پر میر صاحب کے کلام کو جانچا جائے تو اُن کا رتبہ اُردو شعرا میں سب سے اعلیٰ پایا جاتا ہے۔ اُن کے اشعار سوز و گداز اور درد کی تصویریں ہیں، زبان سے نکلتے ہی دل میں جا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ میر صاحب کی عہر کوئی فوس برس کی تھی اور ان کو وفات پائے بھی سو برس سے زیادہ ہوتے ہیں لیکن اب تک یہ حال ہے کہ لوگ اُن کے کلام کو پڑھ کر مزے لیتے اور سر دھنتے ہیں۔

میری یہ رائے میر صاحب کے منتخب کلام کی نسبت ہے ورنہ اُن کی ضخیم کلیات میں رطب و یابس سب کچھ بھرا پڑا ہے۔ مولانا (آزاد) نے اُن کے کلام کی نسبت ایسے تذکرے میں صحیح لکھا ہے کہ ”پستش بغایت پست و بلندش بغایت بلند است“۔ اس پر مولانا حالی کی عام رائے کا نقل کر دینا جو اُنہوں نے شعرا کی نسبت لکھی ہے، لطف سے خالی نہ ہو گا۔

”یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ دنیا میں جتنے شاعر اُستاد مانے گئے ہیں یا جن کو اُستاد ماننا چاہئے، اُن میں ایک بھی ایسا نہ نکالے گا جس کا تمام کلام اول سے آخر تک حسن و لطافت کے اعلیٰ درجے پر واقع ہوا ہو کیونکہ یہ خاصیت صرف خدا ہی کے کلام میں ہو سکتی ہے۔ شاعر کی معراج کہاں یہ ہے کہ اُس کا عام کلام ہموار اور اصول کے موافق ہو اور کہیں کہیں اس میں ایسا حیرت انگیز جلوہ نظر آئے جس سے شاعر کا کہاں خاص و عام کے دلوں پر نقش ہو جائے البتہ اتنی بات ہے کہ اُس کے عام اشعار بھی خاص خاص اشخاص کے دل پر خاص خاص حالتوں میں تقریباً ویسا ہی اثر کریں جیسا کہ اُس کا خاص کلام ہر شخص کے دل پر ہر حالت میں اثر کرتا ہے اور یہ بات اُسی شاعر کے کلام میں پائی جا سکتی ہے جس کا کلام سادہ اور فیچرل ہو۔“

میر صاحب کے کلام میں ایسے حیرت انگیز جلوے اکثر نظر آتے ہیں۔ جس طرح بعض اوقات سمندر کی سطح دیکھنے میں معمولی اور بے شور و شر نظر آتی ہے لیکن اُس کے نیچے ہزاروں لہریں موج زن ہوتی اور ایک کھلبلی سچائے رکھتی ہیں اسی طرح اگرچہ میر صاحب کے اشعار کے الفاظ ملائم دھیمے، سلیس اور سادہ ہوتے ہیں لیکن ان کی تہ میں غضب کا جرش یا درد چھپا ہوتا ہے۔ الفاظ کی سلامت اور ترکیب کی سادگی لوگوں کو اکثر دھوکا دیتی ہے وہ اُن پر سے بے خبر گزر جاتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ شاعر نے ان سلیس الفاظ اور معمولی ترکیب میں کیا کیا کھٹال بھر رکھے ہیں۔ میر صاحب کا کلام اس بارے میں اپنا جواب نہیں رکھتا اور غور سے پڑھنے کے قابل ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ پڑھنے والے قدیم الفاظ یا محاورے یا متروک ترکیب کو دیکھکر شعر چھوڑ دیتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ اسی لفظ یا ترکیب نے جسے وہ متروک سمجھتے ہیں خاص لطف پیدا کر دیا ہے یا کم سے کم وہ شعر کے حسن میں ہارج نہیں۔ میں یہاں چند شعر مثال کے طور پر نقل کرتا ہوں جس سے اُن کے کلام کی حسن و خوبی اور اُن کے خاص انداز کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا
دل ستم زدہ کو ہم نے تہام تہام لیا
مرے سلیقے سے میری فہمی محبت میں
تہام عہر میں قہ کامیوں سے کام لیا

ہم خاک میں ملے تو ملے لیکن اے سپہر
اُس شوخ کو بھی رات پتہ لافا ضرور تھا

(ص)

یاد اس کی اتنی خوب نہیں (میر) باز آ
نادان پھر وہ جی سے بیلایا نہ جائے گا

جو اس شور سے (میر) روتا رہے گا
تو ہمسایہ کا ہے کو سوتا رہے گا

اتنی ہوئیں سب تدبیریں کچھ نہ درانے کام کیا
دیکھا اس بیبھاری دل نے آخر کام کیا
عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں روند
یعنی رات بہت تھ جاگئے صبح ہوئی آرام کیا
فاحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہم کو عبث بد نام کیا
یاں کے سفید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا اور دن کو جڑ توں شام کیا

گل کی جفا بھی دیکھی، دیکھی وفائے بلبل
اک مشقت پر پڑے تھے گلشن میں جاے بلبل

کیونکر گلی سے اُس کی اُتھ کر میں چلا جاتا
یاں خاک میں ملنا تھا، لوہو میں نہانا تھا
کہتا تھا، کسو سے کچھ، نکتا تھا کسو کا منہ
دل (میر) کھڑا تھا یاں، سچ ہے کہ دوانا تھا

جفا گئیں دیکھ لیاں بیوفائیاں دیکھیں
بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں

مطلب کے لئے کیسا خوبصورت پیرایہ اختیار کیا گیا ہے اس قسم کے اظہار حال میں سخت مشکل پیش آتی ہے۔ اور انسان ہزار کوشش کرے اور کیسا ہی پہلو کیوں نہ اختیار کرے پھوڑ پنے سے بچ نہیں سکتا۔ شاعر نے اس بد تمیزی سے بچنے کے لئے پردے ہی پردے میں نہایت خزش اسلوبی کے ساتھ درد دل کی کیفیت کا اظہار کیا ہے اور اس پیرائے سے جو اثر پیدا ہو سکتا ہے وہ کبھی صاف صاف اپنے حال کے بیان کرنے سے نہیں ہو سکتا اور پھر لطف یہ ہے کہ اس میں کہیں معشوق کی جفایا بے وفائی کا ذکر نہیں صرف عاشق کی جوانی اور اس کے حال زار کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور یہ کہہ کے اس کا رونے لگنا، اس کے درد دل کو آشکارا کر دیتا ہے اور یہاں پردہ خود بخود اُٹھ جاتا ہے۔ یہ پیرایہ غضب کا درد انگیز ہے اور پھر معشوق کے جواب نے اس درد میں ہزاروں ٹیسس پیدا کر دی ہیں۔ یہ میر صاحب کا خاص کمال ہے اور یہی چیز ہے جو ان کی شاعری کو ہمیشہ زندہ رکھے گی۔

سرہانے میر کے آہستہ بولو

ابھی تک روتے روتے سو گیا ہے

یہ شعر کس قدر سادہ ہے۔ اس سے زیادہ آسان، عام اور معمولی الفاظ اور کیا ہوں گے، لیکن انداز بیان درد سے لبریز ہے اور لفظ لفظ سے حسرت و یاس ٹپکتی ہے۔ اردو کیا، مشکل سے کسی زبان میں اس پایے کا اور ایسا درد انگیز شعر ملے گا۔ ایک دوسری بات اس شعر میں قابل غور یہ ہے کہ: جو شخص دوسروں کو غل نہ کرنے اور آہستہ بولنے کی ہدایت کر رہا ہے وہ بھی بیمار کے پاس بیٹھا ہے اور اس پر بھی لازم ہے کہ یہ بات آہستہ سے کہے۔ اس کے لئے یہ ضرور ہے کہ لفظ ایسے چھوٹے، سلیس اور دھیمے ہوں کہ دھیمی سی دھیمی آواز میں بھی ادا ہو سکیں۔ اب اس شعر کو دیکھئے کہ لفظ تو کیا ایک حرت بھی ایسا نہیں جو کرخت ہو یا ہونٹوں کے ذرا سے

اشارے سے بھی ادا نہ ہو سکتا ہو۔

جو اس شور سے میر روتا رہے گا

تو ہمسایہ کا ہے کو سوتا رہے گا

اس میں کوئی خاص مضمون یا بات نہیں مگر شعر کس قدر پر درد ہے، دوسرے مصرعے نے اسے نہایت درد انگیز بنا دیا ہے۔ یہ سلاست اور یہ انداز بیان اور اس میں یہ درد میر صاحب کا حصہ ہے۔ ان اشعار کے سامنے صنائع و بدائع، تکلف و مضمون آفرینی، فارسی و عربی ترکیبیں کچھ حقیقت نہیں رکھتیں۔

مقدور بھر تو ضبط کروں ہوں پہ کیا کروں

منہ سے نکل جاتی ہے اک بات بیمار کی

یہ شعر میر کے اعلیٰ یا منتخب اشعار میں سے نہیں ہے ایک معمولی شعر ہے۔ لیکن دل کی ایک فطری کیفیت کو کس خوبی سے بیان کیا ہے اور جیسا یہ خیال فطرتی اور سادہ ہے ویسے ہی الفاظ بھی سادہ اور بندش اور ترکیب بھی صاف اور ستھری ہے مگر انداز بیان کا حسن یہاں بھی وہی ہے۔ ایسے اشعار میر کے کلام میں سینکڑوں ملیں گے، اس لئے یہاں اور اشعار کا مثال کے طور پر لکھنا مضمون کو طول دینا ہے۔

میر صاحب کے کلام میں اخلاقی اور حکیمانہ اشعار کی بھی کچھ کمی نہیں، لیکن اخلاق ہو یا حکمت، اندرونی کیفیت ہو یا بیرونی حالت، انداز بیان وہی ہے۔ نہایت معمولی اور سادہ الفاظ میں بڑے بڑے نکات اور بلند مضامین اس بے تکلفی سے بیان کر جاتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ بلکہ بعض اوقات سرسری طور پر پڑھنے سے خیال نہیں گزرتا کہ ان سادہ الفاظ اور سلیس ترکیبوں کے پورے میں ایسے ایسے بلند خیالات پنہاں ہیں!

مثال کے طور پر یہاں چند شعر لکھے جاتے ہیں:

سرسری تم جہان سے گزرے
 ورقہ ہر جا جہان دیگر تھا
 (کس قدر بلند اور اعلیٰ مضمون ہے مگر کس خوبی اور
 آسانی سے ادا کیا گیا ہے)
 گل پانوں ایک کاسے سر پر جو آگیا
 یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا
 کہنے لگا کہ: دیکھ کے چل راہ بے خیر!
 میں بھی کبھو کسو کا سر پر غرور تھا

وصل و ہجراں سے جو دو منزل ہیں راہ عشق کی
 دل غریب ان میں خدا جائے کہاں مارا گیا

ہم نہ کہتے تھے کہ مت دیر و حرم کی راہ چل
 اب یہ دعویٰ حشر تک شیخ و برہمن میں رہا

یہ بھی طرفہ ماجرا ہے کہ اُسی کو چاہتا ہوں
 مجھ چاہئے ہے جس سے بہت احتراز کرنا
 اوپر کے ان تینوں شعروں میں افسان کی حالت کا کس قدر
 سچا نقشہ کھینچا ہے۔

بارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو
 ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

کہا میں نے: ”کتنا ہے گل کا ثبات“
 کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

بیان کی یہ نزاکت قابل غور ہے:
 ہر دم قدم کو اپنے رکھ رکھا احتیاط سے یاں
 یہ کار گاہ ساری دوکان شیشہ گر ہے

اُڑنے کی ایک ہوس ہے ہم کو قفس سے ورنہ
 شائستہ پرویدن بازو میں پر کہاں ہے
 ملک کی موجودہ سیاسی حالت پر یہ شعر کس قدر صادق
 آتا ہے:-

اب پست و بلند ایک ہے جوں نقش قدم پاں
 پامال ہوا خوب تو ہموار ہوا میں

الہی کیسے ہوتے ہیں جنہیں ہے بندگی خواہش
 ہمیں تو شرم دامنگیر ہوتی ہے خدا ہوتے
 میر صاحب کا کلام عاشقانہ ہے لیکن ان میں اکثر اشعار
 ایسے ملیں گے جن میں کوئی اخلاقی یا حکیمانہ نکتہ نہایت
 خوش اسلوبی سے بیان کیا گیا ہے۔ افسان کی طبیعت کے دو
 رنگ ہیں: لطف و مسرت یا اندوہ و الم۔ میر صاحب کے اشعار
 عاشقانہ ہوں یا حکیمانہ ان میں اندوہ و الم ناکسی و
 مایوسی کی جھلک پائی جاتی ہے، یہ اُن کی طبیعت کی
 اُفتاد ہے، وہ کسی حال میں ہیں، کوئی کیفیت اُن پر طاری ہو،
 اُن کے دل سے جب کوئی بات نکلی وہ یاس و ناکسی میں
 دوبی ہوئی تھی۔ ظرافت کی چاشنی میر صاحب کے کلام میں
 مطلق نہیں مگر نہ معلوم کیا اتفاق ہوتا تھا اور وہ کیسی
 سببہ گھڑی ہوتی تھی کہ جب اُن کے افسردہ اور حرماں نصیب
 دل کی گلی کھلتی اور وہ ایک آدھ شعر اس قسم کا بھی کہہ
 جاتے۔ اُن کے کلام میں چند ظریفانہ اشعار بھی پائے جاتے ہیں
 لیکن یا تو وہ ایسے مبتذل قسم کے ہیں کہ اُن سے بد مذاقی
 پائی جاتی ہے یا وہی حسرت و یاس جو اُن کے دم کے ساتھ
 تھی۔ حیرت ہے کہ ظرافت کے وقت بھی یہ رنگ نہ گیا چنانچہ
 فرماتے ہیں:-

تھا (میر) بھی دیوانہ، پر ساتھ ظرافت کے
 ہم سلسلہ داروں کی زنجیر ہلا جاتا

میر صاحب نے چند قصیدے بھی لکھے ہیں اگرچہ اس میں بھی وہ بند نہیں اور ترکیب و خیال میں باندی پائی جاتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ اس گون کے نہیں تھے اور قصیدہ لکھنا اُن کی طبیعت کی اُفتاد کے خلاف تھا جس کی وجہ ہم آگے چل کر بیان کریں گے اور یہی وجہ ہے کہ اُن کے قصیدے دو چار سے زیادہ نہیں۔

البتہ مثنویاں قابل ذکر ہیں۔ یوں تو چودہ بندرہ مثنویاں ہیں لیکن بعض اُن میں ایسی ہیں کہ اب بھی اُن کا پڑھنا لطف سے خالی نہیں؛ مثلاً دو مثنویاں جو اپنے گھر کی خرابی اور برسات کی شکایت میں لکھی ہیں، خوب ہیں۔ برسات میں اس مصیبت کا حال بہت ہی درد ناک ہے، صحیح اور سچی واردات جو ایسی حالت میں واقع ہوتی ہے، اس طرح لکھی ہے کہ آنکھوں کے سامنے بے سرو سامانی کا نقشہ کھچ جاتا ہے اور غربا پر جو اس موسم میں گزرتی ہے اُس کی حقیقی تصویر اس سے بہتر کہیں نہیں ملتی۔ اس سے میر صاحب کی قوت مشاہدہ اور بیان واقعہ کی قدرت ظاہر ہوتی ہے۔ عشقیہ مثنویوں میں قصے اور بیان کے لحاظ سے سب سے بہتر (شعلۂ عشق) ہے۔ یہ ایک سادہ اور مختصر سا قصہ ہے، لیکن جس طرح اُنھوں نے اُسے اُٹھایا ہے اور آخر تک نبھایا ہے، وہ بہت قابل تعریف ہے۔ یہ پرس رام کی بیوی کی درد ناک کہانی ہے۔ سارے قصے پر یاس و الم کا سایا سا پڑا ہوا نظر آتا ہے۔ اول ابتدا ہی پر درد انجام کا پتہ دیتی ہے۔ جن اشخاص کا اس میں ذکر آیا ہے، اُن کی ساری حالت حقیقی رنگ میں دکھائی ہے۔ قصے کی دلچسپی اس میں نہیں کہ کس کس نے کیا کیا بلکہ اسی راز میں ہے کہ ہرئی اُن ہوئی نہیں ہو سکتی۔ مثنوی میں ہر چیز انسانی زندگی سے کامل طور پر مطابق ہے۔ سوائے انجام کے جسے تخیل کی مرادِ حقیقی سے خیالی زندگی میں آرا لے لئی ہے۔

دوسری عشقیہ مثنوی (دربائے عشق) ہے۔ یہ بھی ایک معمولی قصہ ہے۔ ان دونوں مثنویوں میں بیان سادہ اور بے تکلف اور مسلسل ہے۔ کہیں کہیں فارسی ترکیبیں آجاتی ہیں ورنہ زبان بہت صاف ستھری ہے اور میر صاحب کا اصلی رنگ صاف نظر آتا ہے۔

سب سے بڑی مثنوی ”شکار نامہ“ کی ہے جس میں نواب آصف الدولہ کے شکار کا حال ہے اس میں جا بجا غزلیں آتی ہیں جن کے متعلق کچھ کہنے کی حاجت نہیں۔ اس میں میر صاحب کو خاص کمال حاصل ہے لیکن صفائی بیان و زبان میں یہ ادھر کی دو مثنویوں کو نہیں پہونچتی۔ اس میں فارسیت کا رنگ غالب ہے۔ مثنوی ”جوش عشق“ اور ”خواب خیال“ بھی پڑھنے کے قابل ہیں۔ اگرچہ بظاہر یہ محض خیالی ہیں اور عالم خیال میں بڑے لطف کے ساتھ تخیل کی جولانی دکھائی ہے۔ لیکن خیال کی وسیع فضا میں ایسے واقعات کی کمی نہیں ایسی طرح جھوٹ کی مذمت، مناجات عاشقان، عشق خانہاں آباد کی مثنویاں بھی اپنی اپنی جگہ پر بہت پر لطف ہیں۔ مثنویوں میں بھی میر صاحب کا انداز بیان بہت سادہ اور دلگداز ہے۔ اس سے پہلے اردو میں مثنوی کا یہ انداز کہیں نہیں پایا جاتا۔ مثنوی اصناف نظم میں بہت مشکل ہے، میر صاحب نے اسے خوب نبھایا ہے۔ اردو زبان میں میر صاحب کی مثنویاں سب سے پہلا اور عمدہ نمونہ ہیں، مثنوی کو انھیں کی بدولت ترقی ہوئی، اور میر حسن اور شوق وغیرہ سب انھیں کے مقلد ہیں۔ البتہ خواجہ میر درد کے چھوٹے بیٹائی میر اثر کی مثنوی ”خواب و خیال“ ایک ایسی نظم ہے جو روز مرہ کی صفائی اور زبان کی خوبی کے لحاظ سے کہیں بڑھی ہوئی ہے۔ لیکن رے، ہجر و وصل، راز و نیاز، تغافل، معشوقانہ اور سراپا کی داستان ہے جس میں قصے کا سا کوئی تسلسل نہیں اور اس لئے میر صاحب کی مثنوی ”شعلہ عشق“

کو کسی طرح نہیں پہنچتی، بلکہ اس سے مقابلہ کرنا ہی فضول ہے۔ میر کی مثنویوں کے متعلق مولانا حالی کی رائے بہت سچی اور جچی تلی ہے۔

”اب تک اُردو میں جتنی عشقیہ مثنویاں ہماری نظر سے گزری ہیں اُن میں سے صرف تین شخصوں کی مثنوی ایسی ہے جس میں شاعری کے فرائض کم و بیش ادا ہوئے ہیں: اول میر تقی جنہوں نے غالباً سب سے اول چند عشقیہ قصے اُردو مثنوی میں بیان کئے ہیں۔ جس زمانے میں میر نے یہ مثنویاں لکھی ہیں اُس وقت اُردو زبان میں فارسیت بہت غالب تھی اور مثنوی کا کوئی نمونہ اُردو زبان میں غالباً موجود نہ تھا اور اگر ایک آدھ نمونہ موجود بھی ہو تو اُس سے چنداں مدد نہیں مل سکتی۔ اس کے سوا اگرچہ غزل کی زبان بہت منجھ گئی تھی مگر مثنوی کا راستہ صاف ہونے تک ابھی بہت زمانہ درکار تھا اسی لئے میر کی مثنویوں میں فارسی ترکیبیں، فارسی معاوروں کے ترجمے اور ایسے فارسی الفاظ جن کی اب اُردو زبان متحمل نہیں ہو سکتی اُس انداز سے جو آج کل فصیح اُردو کا معیار ہے بلاشبہ کسی قدر زیادہ پائے جاتے ہیں۔ نیز اُردو زبان کے بہت سے الفاظ و معاورات جو اب متروک ہو گئے ہیں، میر کی مثنوی میں موجود ہیں۔ اگرچہ یہ تمام باتیں میر کی غزل میں بھی کم و بیش پائی جاتی ہیں، مگر غزل میں اُن کی کھپت ہو سکتی ہے کیونکہ غزل میں اگر ایک شعر بھی صاف اور عمدہ نکل آئے تو ساری غزل کو شان لگ جاتی ہے وہ عمدہ شعر لوگوں کی زبان پر چڑھ جاتا ہے اور باقی پر کن اشعار سے کچھ سروکار نہیں رہتا، لیکن مثنوی میں جستہ جستہ اشعار کے صاف اور عمدہ ہونے سے کام نہیں چلتا۔ زنجیر کی ایک کڑی بھی ناہموار اور بے میل ہوتی ہے تو ساری زنجیر آنکھوں میں کھٹکتی ہے۔ پس ان اسباب سے شاید میر کی مثنوی آج کل کے لوگوں کی نگاہ میں

فہ جیسے مگر اس سے میر کی شاعری میں کچھ فرق نہیں آتا، جس وقت میر نے یہ مثنوی لکھی ہے اُس وقت اس سے بہتر زبان میں مثنوی لکھنی اسکاں سے خارج تھی۔ با ایں ہمہ میر کی مثنوی اکثر اعتبارات سے امتیاز رکھتی ہے۔ باوجودیکہ میر صاحب کی عہر غزل گوئی میں گزری ہے مثنوی میں بھی بیان کے انتظام اور تسلسل کو انہوں نے کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور مطالب کو بہت خوبی سے ادا کیا ہے جیسا کہ ایک مشاق اور ماهر استاد کر سکتا ہے۔ اس کے سوا صاف اور عمدہ شعر بھی میر کی مثنوی میں بہ مقابلہ اُن اشعار کے جن میں پرانے محاورے یا فارسیات غالب ہے کچھ کم نہیں ہیں صدھا اشعار میر کی مثنویوں کے آج تک لوگوں کے زبان زد چلے آتے ہیں۔

اگرچہ میر کی مثنویوں میں قصہ پن بہت کم پایا جاتا ہے انہوں نے چند صحیح یا صحیح نہا واقعات بطور حکایات کے سیدھے سادے طور پر بیان کئے ہیں نہ اُن میں کسی شادی یا تقریب یا وقت اور موسم کا بیان کیا گیا ہے نہ کسی باغ یا جنگل یا پہاڑ کی فضا یا اور کوئی تہاتھ دکھایا گیا ہے مگر جتنی میر کی عشقیہ مثنویاں ہم نے دیکھی ہیں وہ سب نتیجہ خیز اور عام مثنویوں کے بر خلاف بے شرمی اور بے حیائی کی باتوں سے مبرا ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ میر کے کلام میں فارسیات کا رنگ زیادہ ہے مگر اس پر بھی صاف اور ستھریے اشعار بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ فصاحت اور سلاست متاخرین کے کلام سے کہیں زیادہ ہے اگرچہ میر اور اُن کے ہم عصر شعراء کے کلام میں فارسیات غالب ہے لیکن اس زمانے میں عربیت کا رنگ جو غالب ہوتا جاتا ہے وہ اُس سے کچھ کم نہیں ہے اُن بزرگوں نے تو پھر بھی یہ کیا کہ جہاں کثرت سے فارسی الفاظ اور محاورے اور فارسی ترکیبیں داخل کیں وہاں بہت سے الفاظ کو اپنا

کر لیا اور صرف صرف و نحو کے خواجہ پر چڑھا کر اُردو بنا لیا۔
 لیکن آج کل یہ کرشمہ کی جاتی ہے کہ عربی الفاظ اور ترکیبوں
 کو بچوں کا توں رکھا جائے ایسا نہ ہو کہ یہ مقدس الفاظ
 اُردو صرف و نحو کے چھوڑ جانے سے نجس ہو جائیں۔ اُن بزرگوں
 نے زبان کو بنانے اور وسیع کرنے کی کوشش کی اور بہت بڑا
 اجساں کیا مگر آج کل لوگ اُن کی تقلید کو ننگ سمجھتے
 اور اُن کی کوششوں کو ”غلط العام“ سے تعبیر کرتے ہیں حالانکہ
 وہ صحیح اصول پر چل رہے تھے اور ہم باوجود ہمہ دافی کے
 زبان کی اصلی ترقی و نشو و نما کے گُر سے قاصر ہیں۔ ایک
 دوسرا فریق جو فارسی عربی کے مقبّل الفاظ نکال کر اُن کی
 جگہ غیر مازوس اور ثقیل سنسکرت کے الفاظ تھوہنسا چاہتا ہے
 اسی فافہی میں مبتلا ہے۔ ہماری رائے میں یہ دونوں
 زبان کے دشمن ہیں۔ اس رجحان کے خاص اسباب ہیں جن پر ہم
 اِس وقت بحث کرنی نہیں چاہتے اور اُسے کسی دوسرے وقت
 کے لئے اُتھا رکھتے ہیں لیکن اِس قدر ضرور جتنا دینا چاہتے
 ہیں کہ اگر ہمیں اپنی زبان سے محبت ہے اور در حقیقت ہم
 اُس کی ترقی کے خواہاں ہیں تو ہمیں پھر اُسی اُصول کو
 اختیار کرنا چاہئے۔

خود میر صاحب نے فارسی الفاظ و تراکیب کے استعمال کے
 متعلق اپنے تذکرۂ شعرائے اُردو یعنی ”نکات الشعراء“ میں جو
 رائے ظاہر کی ہے وہ بہت ہی مناسب اور خوب ہے اور اب
 بھی قابلِ عمل ہے، وہ لکھتے ہیں:-

”سیوم آنکہ حرف و فعل پارسی بکار برند و اِس قبیح است
 چہارم آنکہ ترکیبات فارسی می آرند، اکثر ترکیب کہ مناسب

میر صاحب کا تذکرہ نکات الشعراء ہندی بہت نایاب ہے
 اتفاق سے دستیاب ہو گیا اور انجمن ترقی اُردو کی طرف سے شائع
 ہو گیا ہے۔

زبان ریختہ سی اُفتد آن جائز است و این را غیر شاعر نہیں
 دانند و ترکیبے کہ نامانوس ریختہ میں باشد آن معیوب است
 و دانستنِ این نیز موقوف سلیقہ شاعری است و مختار فقیر
 ہوئی است، اگر ترکیب فارسی موافق گفتگوئے ریختہ بود
 مضائقہ نہ آرد۔“

بہر حال میر کی مثنویوں کے بیسہوں شعر جو اب تک
 زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں اُس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ
 وہ اپنے زمانے میں بہت مقبول تھیں اور اب بھی تاریخی لحاظ
 سے، نیز اپنی بعض خوبیوں کی وجہ سے پڑھنے کے قابل ہیں۔
 یہاں بطور نمونے کے ایسے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں جو
 اس وقت بھی زبان زد خاص و عام ہیں :
 ضبط کروں میں کب تک آہ اب چل اے خامے بسم اللہ اب

فی کعبے نی دیر کے قابل مذہب اُن کا ہے سیر کے قابل

مہر جی اس طرح سے آتے ہیں جیسے کدھر کہیں کو جاتے ہیں

سداۓ عزیزان فی ہرہ و عقل
 کہ اِس کارواں گہ سے کرنا ہے نقل

پیہر ہے، شد ہے کہ درویش ہے
 سبھوں کو یہی راہ درپیش ہے

نہ یک بوے خوش می ہوا ہو گئی وہ رنگینیء باغ کیا ہو گئی

جس کسو سے یہ پیار رکھتا ہے عاقبت اُس کو مار رکھتا ہے

کہتے ہیں تہمتے اچھلتے ہیں تو بے ایسے کوئی نکلتے ہیں

رفتہ رفتہ ہوا ہوں سودا ئی دور پہنچی ہے میری رسوائی

آہ جو ہمد می سی کرتی ہے اب تو وہ بھی کھی سی کرتی ہے

ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ صبر رخصت ہوا ایک آہ کے ساتھ
میر صاحب کی رباعیات بھی کچھ کم پر لطف نہیں
اور بعض تو بہت اچھی ہیں ان کے علاوہ متفرق محسن مستزاد
اور فرد وغیرہ ہیں لیکن میر کا اعلیٰ رنگ غزل اور مثنوی ہی
میں پایا جاتا ہے اور اس میں اُن کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا
وہ غزل کے بادشاہ ہیں اور اُن کی جتنی تعریف کی جائے کم
ہے اہل ذوق خود پڑ کر اس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

شاعر نہیں جو دیکھا تو تو ہے کوئی ساحر
دچار شعر پڑ کر سب کو رجھا گیا ہے
بعض بعض جگہ میر صاحب نے فارسی اشعار کا اردو میں اس
خوبی سے ترجمہ کر دیا ہے کہ اصل سے بڑھ گیا ہے سعدی کا ایک شعر ہے:-
دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم
باید اول بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی!
میر صاحب فرماتے ہیں:-

پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ
اُن سے بھی تو پوچھئے تم اتنے کیوں پیارے ہو
اس شعر میں پیارے کے لفظ نے جو حسن پیدا کر دیا ہے وہ
اہل ذوق سے پوشیدہ نہیں - سعدی کا ایک اور شعر ہے :
گفتہ بودم چو بیائی غم دل با تو بگویم
چہ بگویم کہ غم از دل بررد چون تو بیائی
میر صاحب نے اسی مضمون کو کس خوبی سے
ادا کیا ہے:-

کہتے تھے کہ یوں کہتے ہیں کہتے اگر آتا
سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا
ایک فارسی شعر ہے:-

(ہو)

عَلَمًا سِرُّو بِرْ گِیمِ مِیْرَسِ ازِ فِقْرًا هِیچِ
عَالَمِ هَمْدِ اِفْسَانْدَهٗ مَادَارِدِ وِ مَاهِیچِ
مِیْرِ نَے اِس مَضْمُونِ کو کِس خُوبی سے اِنپے خَاصِ اَنْدازِ
مِیْنِ بَیَانِ کِیا هے :—

مشہور ہیں عالم میں تو کیا ہیں بھی کہیں ہم
القصد نہ درپے ہو ہمارے کہ نہیں ہم
کہتے ہیں کہ انسان کا طرزِ بیان اُس کی سیرت کا پر تو
ہوتا ہے ، یہ مقررہ شاعر کے کلام پر اور بھی زیادہ صادق آتا
ہے ۔ لیکن غالباً کسی شاعر کے کلام پر اس کی طبیعت اور
سیرت کا اس قدر اثر نہ پڑا ہوگا جتنا میر کے کلام میں نظر
آتا ہے ۔ جو شخص میر کے حالات اور اُن کے اخلاق و سیرت
سے واقف نہ ہو ، وہ اُن کے کلام کو پڑھ کر بغیر کسی تذکرے
کی مدد کے خرد بخرد اُن کے انداز ، اُن کی طبیعت کی اُفتاد
اور مزاج کو تازہ جائیگا ۔ اُن کے اشعار پڑھ کر یہ معلوم ہوتا
ہے کہ اُن کے ایک ایک لفظ ، طرزِ بیان ، ترتیب و بندش میں
اُن کے قلبی واردات و احساسات کا نقشہ کھینچا ہوا ہے ، وہ
شعر میں اپنا دل نکال کے رکھ دیتے ہیں اور اُن کی جدت
بیان میں صاف اُن کے تیور نظر آتے ہیں ۔ میر صاحب کی
سیرت اُن کے کلام سے کچھ کم قابلِ قدر نہیں بلکہ میری رائے
میں زیادہ قابلِ وقعت ہے ۔ کلام میں تو صرف یہی ہے کہ اُسے
پڑھ کر ایک خاص قسم کی لذت حاصل ہوتی ہے یا اُس کے اثر
سے متاثر ہو کر لطف ملتا ہے ، لیکن سیرت کی خوبی دوسروں
کی اصلاح کرتی اور اُن کو بناتی ہے ۔ کلام کا لطف تو ممکن
ہے کسی کو نہ آئے لیکن سیرت کے اثر سے بہت کم ہیں کہ
متاثر نہ ہوں ، اس میں ایک زبردست اخلاقی قوت ہے جو
اصلاح کا بڑا ذریعہ ہے اور کلام و سیرت میں وہی فرق ہے جو
قول و فعل میں ہوتا ہے ۔ میر کی وضعداری نے کمال کی لاج
رکھ لی ۔ اُنھوں نے شاعری کو ذریعہٴ عزت یا وسیلہٴ معاش

نہیں بنایا۔ اُن کا صبر و استقلال، اُن کی قناعت و بے نیاوی اور اُن کی غیرت اور رضاءِ رازی و خویاں ہیں جو انسان کو کمالِ انسانیت پر پہنچاتی اور فرشتوں سے بڑھادیتی ہیں و فوجِ عالم سے مگر کبھی اُن تک نہ کی، فاتح سے رہے مگر کیا مجال کہ بھول کر بھی زبان پر حرفِ شکایت آتا ہو۔ اور یہی نہیں بلکہ کسی دوسرے کی بھی یہ مجال نہ تھی کہ اُن سے معمولی طریقے پر سلوک کرنے کی جرأت کر سکے یا ایسا خیال بھی دل میں لاسکے۔ محتاج رہے مگر مہکن نہ تھا کہ کسی کے سامنے دست و پا پھیلائیں، ان کے مذہب میں یہ کفر تھا۔ وہ اپنے کمال میں مگن تھے اور خرد اپنے تئیں اتلیم سخن کا شہنشاہ سمجھتے تھے۔ وہ دنیا کے مال و دولت کو کبھی خاطر میں نہ لائے، شاہوں کی شان و شوکت اور امیروں کی جاہ و ثروت اُن کے سامنے ہیچ تھیں۔ کسی کے سامنے سر جھکانا یا کسی سے اظہارِ مدعا کرنا، اُن کے ہاں سب سے بڑی معصیت تھی۔

سر کسو سے فرو نہیں ہوتا

حیف بندے ہوئے خدا نہ ہوئے

ان سے یہ توقع رکھنی کہ وہ کسی کی مدح میں قصیدہ لکھیں بالکل عبث ہے اُن کی غیرت یہ کب گوارا کر سکتی تھی کہ کسی نا اہل کی بھٹائی کریں، یہ اُن کی فطرت کے خلاف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دو تین قصیدے جو اُنہوں نے عہر بھر میں لکھے وہ اُن کے دوسرے کلام کے سامنے بے مزہ، پھیکے اور بے لطف ہیں کہ خود فرماتے ہیں:—

مجھ کو دماغ وصف گل و یا سہن نہیں

میں جوں نسیم باد فروش چہن نہیں

اس میں شک نہیں کہ (میر) کے کمال کی قدر خود انہیں کے زمانے میں ایسی ہرئی کہ کم کسی کو نصیب ہوتی ہوگی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ قدر زیادہ تر اُن کے زبردست

(بح)

کیرکٹر یعنی سیرت کی وجہ سے ہری ورنہ کمال کی قدر
جیسی کچھ ہوتی ہے وہ معلوم ہے۔ یہ اُن کے صبر و استقلال
اور استغنا و قناعت کی قوت تھی کہ اُن کے سامنے اچھوں
اچھوں نے سر جھکائے اور زانویں ادب تہہ کئے۔ یہاں تک کہ
ذواب آصف اندر اور ذواب سعادت عالی خاں بھی اُن کا بڑا ادب
و احترام کرتے اور بڑی عزت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ لیکن اُن
کی نازک مزاجی اور بد دماغی کی کیفیت اُن والیان ملک
سے بھی دھی تھی جو اوروں کے ساتھ تھی اور صبر و قناعت اور
غیرت و خرد داری نے اس کی لی اور پڑھادی تھی حتیٰ کہ
بعض وقت وہ لوگ بھی جو اُن کے دل سے قدر داناں تھے اور اُن
کی ناز برداری کو اپنا فخر سمجھتے تھے ان کی بد دماغی
سے عاجز آجاتے تھے۔ وہ اپنے کمال کے سامنے کسی کی کوئی
حقیقت نہیں سمجھتے تھے اور جاؤ بیجا بد دماغی کر بیٹھتے
تھے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود بھی اس سے واقف تھے۔
چنانچہ کہتے ہیں:—

حالت تو یہ کہ مجھ کو غموں سے نہیں فراغ
دل شورش درونی سے جلتا ہے جوں چراغ

سینہ تھام چاک ہے سارا جگر ہے داغ
ہے نام مجلسوں میں موا (میر) بے دماغ

از بسکہ کم دماغی نے پایا ہے اشتہار

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:—

تری چال تھی تری بات روکھی

تجھے میر سمجھا ہے یاں کم کسو نے

اس نازک مزاجی اور خرد داری کے ہاتھوں وہ زندگی
سے بیزار رہے اور ہمیشہ دکھ درد سہتے اور خون جگر
کھاتے رہے اور اسی خون جگر سے اُنہوں نے زمین شعر کو سینچا
جواب تک تروتازہ ہے —

محبہ کو شاعر نے کہہ (میر) کہ صاحب میں نے
 درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا
 افسوس کہ آرام و راحت و زندگی اور مسرت اُن کی قسمت
 میں نہ تھی اور اُنہوں نے اپنی زندگی اس دنیا میں ایک
 حرام فحش قیدی کی طرح کاٹی۔ یہ معنوم ہوتا ہے کہ نیم
 واک کا ایک ابر سیہ ہمیشہ اُن پر چھایا ہوا ہے جس میں سے
 خوشی کی ایک کون بھی چین کر اُن پر نہیں گرتی اور یہی
 رنگ اُن کے اشعار سے ٹپکتا ہے گویا وہ اور اُن کا کلام ایک
 ہو گئے ہیں اور یہ انتہائے کمال شاعری ہے۔ وہ اپنی اس کیفیت
 کو خود بیان کرتے ہیں:—

یاروئے یار لایا اپنی تو یوں ہی گزری
 کیا ذکر ہبصفیراں یاران شاد ماں کا
 قید قفس میں ہیں تو خدمت ہے فالگی کی
 گلشن میں تھے تو ہم کو منصب تیار و خدمت خزان کا
 ایک دوسری غزل کے چند اشعار ہیں:—

یہ میر ستم کشتہ کسو وقت جوان تھا
 انداز سخن کا سبب شور و فغاں تھا
 جادو کی پوری پرچہ ابیات تھا اُس کا
 منہ تکتے غزل پڑھتے، عجب سحر بیان تھا
 جس راہ سے وہ دل زدہ دلی میں نکلتا
 ساتھ اُس کے قیامت کا سا ہنگامہ رواں تھا
 افسردہ نہ تھا ایسا کہ جوں اب زدہ خاک
 آندھی تھا، بلا تھا، کوئی آشوب جہاں تھا
 غافل تھے ہم احوال دل خستہ سے اپنے
 وہ گنج اسی گنج خرابہ میں نہاں تھا
 باوجود ان حالات کے اُنہوں نے خودداری کو کبھی ہاتھ
 سے نہیں دیا اور اضطراب میں بھی کوئی فعل اُن سے ایسا
 سرزد نہیں ہوا جو اُن کی شان اور وضعداری کے خلاف ہوتا

آج ہم اُن کی نازک مزاجی اور خود داری کے واقعات اور لطیفے شوق سے پڑھتے اور اُن برفِ کھڑے کرتے ہیں اور اُن سے وہی لطف حاصل ہوتا ہے جو اُن کے کلام سے ہو سکتا ہے بلکہ اثر میں اُن کے حالات اُن کے کلام سے کہیں زیادہ ہیں ، خوب کہا ہے :-

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنئے گا
پڑھتے کسی کو سنئے گا تو دیر تلک سرد سنئے گا
یہ وہ لوگ ہیں کہ باوجود مصائب و آلام کے ان کے پاے
ثبات کو لغزش نہ ہوئی ، اُنہوں نے اپنے کلام کی عزت قائم
رکھی اور اپنے افعال سے اس کو ذلیل نہیں کیا ۔ کمال کی وجہ
سے اُن کی عزت نہیں ہری بلکہ ان کی وجہ سے ان کے کمال
کا رتبہ دہ چند بڑھ گیا اسی وجہ سے میر کی زندگی سبق آموز اور
عبرت خیز ہے ، سبق اُن کے لئے جو کسب کمال کی راہ میں گام زن
ہیں اور اُن کے گرد و پیش موافقات اور سامنے ترغیبات کا جال بچھا ہوا
ہے ۔ یہی اُن کا امتحان ہے ، اُن پر لازم ہے کہ وہ رے راست
پر ثابت رہیں اور اپنے قدم میں لغزش نہ آنے دیں ۔ عبرت
ہے اُن کے لئے جو اپنے کمال کو اپنی ہوس کے پورا کرنے کا
ذریعہ قرار دیتے ہیں اور اُسے ایک دوکان داری سمجھتے
ہیں اور اپنی بے حمیتگی سے اپنے کمال کو بتا لگاتے ہیں ۔ اگر
کسی میں ہزار کمال ہوں لیکن اس میں میر کی سی خود داری
صبر و استقلال غیرت اور وضع داری نہ ہو تو ایسے شخص
کا وجود دنیا کے لئے بیکار ہے اور خود اس کے کمال کے لئے
باعث فتنہ و دعا رہے ۔ اُن بے تہوں کو جنہیں اتفاق سے

* 'بے تہ' خاص میر صاحب کا لفظ ہے اُنہوں نے اسے کم مایہ
کے معنوں میں استعمال کیا ہے آج کل سطحی کا لفظ استعمال
ہوتا ہے جو ایک انگریزی لفظ کا ترجمہ ہے اور بے تہ کے مقابلے میں
بہت بھونڈا اور ثقیل ہے ۔ یہ لفظ استعمال کرنے اور دواج دینے
کے قابل ہے ۔

(بک)

ہلدی کی گڑھ ہاتھ لگ جاتی ہے اور پنساری بن بیٹھتے ہیں، میر کی زندگی کا مطالعہ غور سے کرنا چاہئے تب انہیں معلوم ہوگا کہ ایک صاحب کھال کے تیور ہی اور ہوتے ہیں —

میر کا کلام اور اُن کی سیرت دونوں قابل مطالعہ ہیں اور دونوں نے ملکر میر کا رتبہ اُردو شعرا میں نہایت بلند کر دیا ہے۔ ایسے با کمال اور صاحب سیرت لوگ کہیں مدتوں میں پیدا ہوتے ہیں اور اُن کا نقش ایسا مستقل اور گہرا ہوتا ہے کہ زمانہ مٹا نہیں سکتا، خوب کہا ہے :-

ممت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں

تب خاک کے پردے سے افسان نکلتے ہیں

میر صاحب کو دربارداری اور امرا کی ملاقات سے طبعاً نفرت تھی۔ صاحب آب حیات لکھتے ہیں کہ:-

”گورنر جنرل اور اکثر صاحبان عالیشان جب لکھنؤ جاتے تو اپنی قدردانی سے یا اس سبب سے کہ اُن کے میر منشی اپنے علو حوصلہ سے ایک صاحب کھال کی تقریب واجب سمجھتے تھے، میر صاحب کو ملاقات کے لئے بلاتے، مگر یہ پہلو تھی کرتے اور کہتے کہ مجھ سے جو کوئی ملتا ہے تو یا مجھ فقیر کے خاندان کے خیال سے یا میرے کلام کے سبب سے ملتا ہے۔ صاحب کو خاندان سے غرض نہیں، میرا کلام سمجھتے نہیں، البتہ کچھ افعام دیں گے، ایسی ملاقات سے ذلت کے سراپا حاصل“ —

اس سے زیادہ قابل لحاظ ایک واقعہ صاحب گلشن ہند نے لکھا ہے جس کا یہاں نقل کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں :-

”جن ایام میں کہ درخواست صاحب عالیشان کی زبان د افان ریختہ کے مقدمے میں کلکتے سے لکھنؤ گئی تو پہلے کرنیل اسکات صاحب کے روبرو تقریب میر کی ہوئی لیکن علت پیری سے یہ بیچارے مجھول کے معمول ہوئے اور نوجوان

نوشق مربی گری سے قوت بدنی کے مقبول ہوئے۔ زمانہ خوش طبعوں سے نہیں خالی ہے، اکثر اہل لکھاؤ پکارتے تھے کہ ملکاتے میں شاعری کی جا درخواست جمالی ہے، کس واسطے کہ یہ جانتے سب اہل تمیز ہیں کہ آج بھی بوزھے کے سامنے فرجون غارے میں موازنہ ہیں۔ اب بھی جو بوجھ تہذیب معنی کا جرثقیل طبع سے توازن کر کے رہ دکھاتا ہے جوان اگر کوہ برقیس ہے تو تھیل سے اس کے کمر چراتا ہے۔

غالباً اس جگہ کے لئے میر شیرعلی افسوس کا انتخاب ہوا۔ یہ اردو زبان کی بد نصیبی تھی کہ میر صاحب کا انتخاب نہ ہو سکا۔ چونکہ اُن کی نظم میں غایت درجہ فصاحت و شیرینی اور سلاست اور گہلاوت پائی جاتی ہے۔ اس لئے ممکن تھا کہ وہ قدرت ولیم کالج میں جا کر نثر میں دوی ایسی یادگار چھوڑ جاتے کہ اہل زبان اُن کی نظم کی طرح اسے سراور آنکھوں پر رکھتے اور (میر امن) کی چہار دریش کی طرح اردو ادب میں اس کا نام بھی روشن ہوتا۔

اب ایک سول یہ باقی ہے کہ میر کی شاعری کا اثر ان کے ہم عصروں اور ما بعد کے شاعروں پر کیا پڑا؟ اگرچہ میر صاحب کی شاعری کی خود اُن کے زمانے میں بے انتہا قدر ہوئی اور اب تک لوگ اُن کی استمادی کا لڑھا مارتے ہیں لیکن حیرت ہے کہ اُن کے آخر زمانے نیز ما بعد کی شاعری پر میر کا مطلق اثر نہیں ہوا۔ لکھنؤ کی شاعری کا رنگ بالکل جدا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل لکھنؤ جس کلام کی اس قدر دل سے داد دیتے تھے اور جیسے پڑے پڑے کو جھومتے اور سر دھنتے تھے اُس سے وہ مطلق متاثر نہ ہوئے اور اُس نے ایک جدا گانہ روش اختیار کی جسے میر کے انداز سے کچھ نسبت نہیں۔ مولانا حالی نے اپنے مقدسہ شعرو شاعری میں اس کی وجہ بتائی ہے جسے یہاں بجنسہ نقل کیا جاتا ہے:-

”شعراء الدور کے زمانے سے سعادت علی خاں کے وقت تک

اُردو کے تہام نامور شعرا کا جھگڑتا لکھنؤ ہی میں رہا یہاں تک کہ میر، سردار، سوز، حرأت، مصحفی، اور انشا وغیرہ اخیر دم تک رہیں رہے اور وہیں مرے، مگر متاخرین کی غزل میں اُن کے طرز بیان کا اثر بہت کم پایا جاتا ہے۔ ظاہراً ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب دلی بگڑ چکی اور لکھنؤ سے زمانہ موافق ہوا اور دلی کے اثر شریف خاندان اور ایک آدھ کے سوا تہام نامور شعرا لکھنؤ ہی میں جارہے اور دولت و ثروت کے ساتھ علوم قدیمہ نے بھی ایک حد تک ترقی کی تو اُس وقت فیچرل طور پر اہل لکھنؤ کو ضرور یہ خیال پیدا ہوا ہوگا کہ جس طرح دولت اور منطق و فلسفہ وغیرہ میں ہم کو فوقیت حاصل ہے اسی طرح زبان اور لب و لہجے میں بھی ہم دلی سے فایق رہیں، لیکن زبان میں فوقیت ثابت کرنے کے لئے ضرور تھا کہ اپنی اور دلی کی زبان میں کوئی امر ماہ الامتیاز پیدا کرتے۔ چونکہ منطق و فلسفہ و طب و عام کلام وغیرہ کی سہارست زیادہ تھی خود بخود طبعیتیں اس بات کی مقتضی ہوئیں کہ بول چال میں ہندی الفاظ رفتہ رفتہ ترک اور اُن کی جگہ عربی الفاظ کثرت سے داخل ہونے لگے یہاں تک کہ سیدھی سادی اُردو اُمر اور اہل عام کی سوسائٹی میں متروک ہی نہیں ہوگئی بلکہ جیسا کہ نقات سے سمجھا گیا ہے معیوب اور بازیوں کی گفتگو سمجھی جانے لگی اور یہی رنگ رفتہ رفتہ نظم و نثر پر بھی غالب آگیا۔ —

اصل بات یہ ہے کہ ملک کی شاعری اُس کے تمدن کے تابع ہوتی ہے۔ جو سوسائٹی جس رنگ میں ترویج ہوئی ہوتی ہے اسی کی جہلک اُس کی نظم و نثر میں آجاتی ہے اگر ہم اُس زمانے کے لکھنؤ کو دیکھیں اور اُس کے تمدن پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ اہل لکھنؤ کے کھانے پینے، رہنے سہنے، لباس، آداب و اطوار غرض تہام طرز معاشرت میں سراسر تصنع اور تکلف پایا جاتا تھا۔ انہیں سوچ سمجھکر کسی خاص امتیاز

کے پیدا کرنے کی ضرورت نہ تھی بلکہ جو عام روشن زندگی کے
 ہر شعبے میں نظر آتی تھی، اُسی میں اُن کا علم ادب بھی
 رنگا ہوا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ منطق و فلسفہ اور
 علم کلام کی مہارت نے اُن کے علم ادب پر اثر الا لیکن اس سے قبل
 دلی میں بھی ان علوم کا چرچا تھا اور دور دور سے طالب علم
 ان علوم کی تحصیل کے لئے وہاں آتے تھے، لیکن وہاں کی بول چال
 اور نظم و فثر پر کبھی ایسا برا اثر نہیں پڑا۔ مگر اُس زمانے
 کے لکھنؤ کی ممتاز خصوصیت تصنع اور تکلف تھی اور یہ اُن کے
 تمدن کے ہر پہلو اور ہر شعبے میں صاف نظر آتی ہے۔ وہ
 فنی تراش خراش اور جدت پر متے ہوئے تھے اور عوام و خواص
 میں اس کی بڑی قدر ہوتی تھی، اس لئے سب کے سب اُدھر
 ہی ڈھل گئے اور ساری ہمت تکلفات میں صرف کردی۔
 سادگی کی جگہ بناوت نے اور فطرت کی جگہ صنعت نے لے لی۔
 میر اور اُن کے ہم عصروں کا اثر زائل ہو گیا اور اُن کے بجائے
 دوسرے استاد پیدا ہوئے جو اُس سوسائٹی کے سپوت اور اُس تمدن
 کے پروردہ تھے۔ حضرت ناسخ اور اُنکے بعد خواجہ وزیر، صبا، رشک
 اور امانت وغیرہ کے کلام میں سوائے ضلع جگت، لفظی مناسبت
 اور تلاؤمہ اور دیگر تکلفات کے کچھ بھی نہیں۔ فثر میں
 اس کا سب سے عمدہ نمونہ مرزا رجب علی سرور کا فسانہ عجائب
 ہے۔ اس دور کا اثر ایک مدت تک رہا اور شاید اب
 بھی لکھنؤ کی سر زمین میں کہیں کہیں باقی ہو۔ لیکن یہ
 چلنے والی چیز نہ تھی آخر اس کا زور تو تباہ جس میں
 بیرونی اثر کو بھی دخل ہے۔ میر مجروح اور مولانا حالی کے
 کلام میں کچھ کچھ میر کا رنگ نظر آتا ہے۔ فثر میں
 فورت ولیم کالج، مرزا غالب، سر سید احمد خان، مولانا حالی،
 مولوی محمد حسین آزاد وغیرہ نے ایک نئی روح پھونکی۔
 انجمن پنجاب نے بھی اُردو نظم و فثر کی اصلاح میں مدد دی۔
 یہ اثر زیادہ تر مغربی رنگ نے پیدا کیا۔ آج کل اُردو پھر

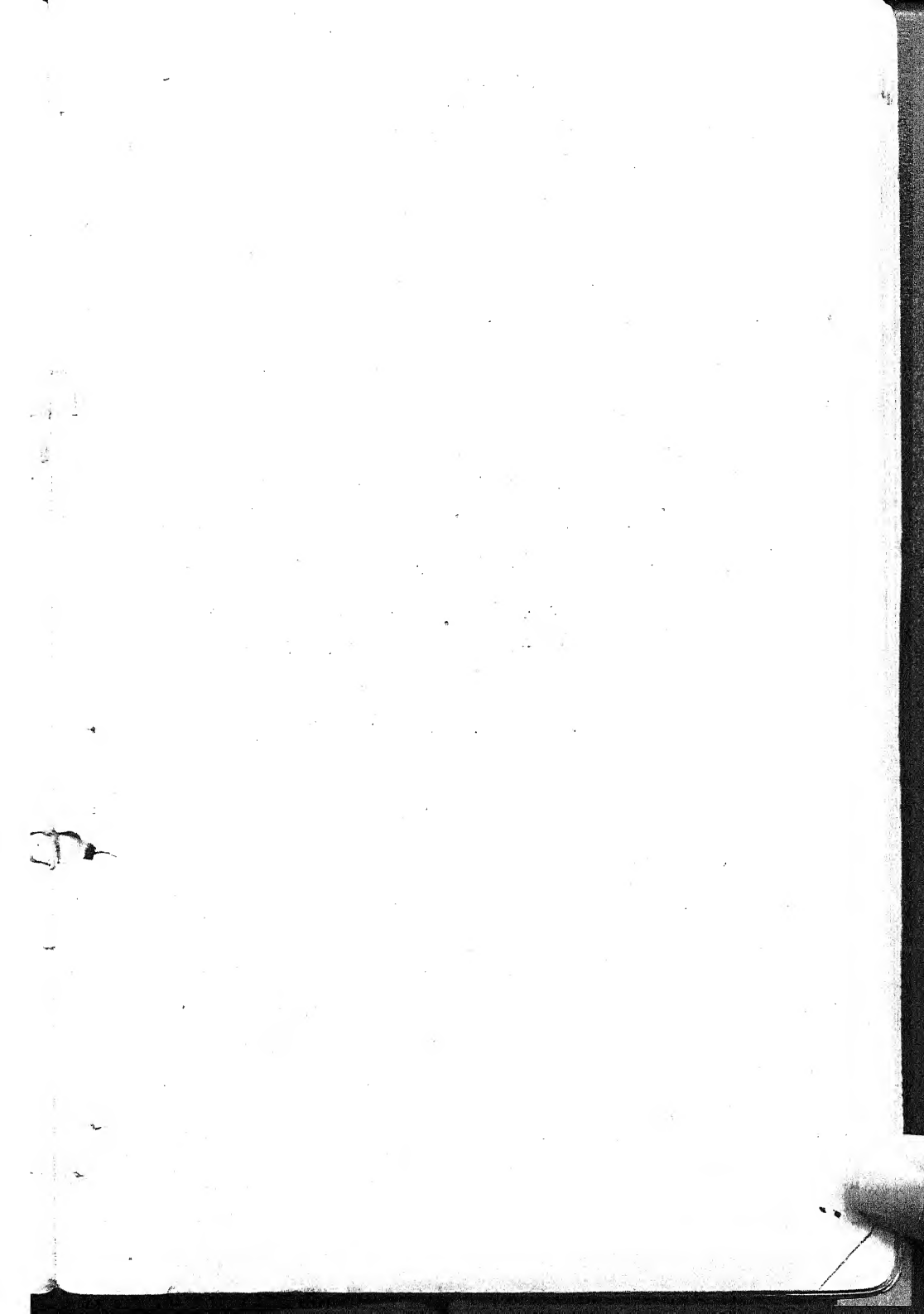
ایک تذبذب کی حالت میں ہے۔ ہندو مسلمان کے اختلاف نے اردو پر بہت برا اثر ڈالا ہے، ایک فریق عربی پر تلا ہوا ہے اور دوسرا فریق سنسکرت پر۔ دونوں غلطی پر ہیں۔ زمانے کے اقتضا سے زبان بچ نہیں سکتی اور یہ اُسی کا اثر ہے۔ لیکن جو اسباب اُس کے باعث ہوئے ہیں وہ سب عارضی ہیں اور قائم رہنے والے نہیں۔ جب لوگ اردو زبان کی تاریخ، اُس کی ابتدا اور اُس کے نشو و نما پر غور کریں گے اور زبان کے عہدہ نمونے اُن کے پیش نظر ہوں گے تو وہ اس بیراہ روی سے خود بخود باز آجائیں گے جس میں سب سے بڑی تقویت مغربی تعلیم، وہاں کے عہدہ نمونوں اور صحیح تنقیدی اصولوں سے ملیگی اور گو میر کا حقیقی اور اصلی رنگ واپس نہ آئے مگر اُس کا کلام پھر بھی اسی شوق و ذوق سے پڑھا جائے گا اور جس حسن و سادگی کو ہم بھولے ہوئے ہیں اُس کی یاد کو تازہ کرتا رہے گا اور ہمیں بہتکئے سے روکتا رہے گا۔ یہ کیا کم احسان ہے؟—

سہل ہے (میر) کا سمجھنا کیا؟

ہر سخن اُس کا ایک مقام سے ہے

عبدالحق





بسم اللہ الرحمن الرحیم

انتخاب غزلیات

ردیف الف

تھا مستعار حسن سے اُس کے جو نور تھا
خورشید میں بھی اُس ہی کا ذرہ ظہور تھا
ہنگامہ گرم کن جو دل نا صبور تھا
پیدا ہر ایک نالے سے شور نشور تھا
بہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں
معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا
آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم
یک شعلہ برق خرمن صد کوہ طور تھا
مجلس میں رات ایک ترے پر توے بغیر
کیا شمع کیا پتنگ ہر اک بے حضور تھا
مذہم کے پاس قائم و سنجاب تھا تو کیا
اُس رند کی بھی رات کتنی جو کہ عور تھا
ہم خاک میں ملے تو ملے لیکن اے سہر
اُس شوخ کو بھی راہ پہ لانا ضرور تھا
کل پاؤں ایک کاسے سر پر جو آگیا
پکسروہ استخوان شکستوں سے چور تھا

کہئے لگا کہ دیکھہ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھو کسو کا سر پر غرور تھا
تھا وہ تو رشک حور بہشتی ہمیں میں میر
مسجد نے ہم تو فہم کا اپنے قصور تھا

کیا میں بھی پریشانی خاطر سے قرین تھا
آنکھیں تو کہیں تھیں دل غم دیدہ کہوں تھا
آیا تو سہی وہ کوئی دم کے لئے لیکن
ہونٹوں پہ مرے جب نفس باز پسین تھا
شب کوفت سے ہجراں کی جہاں تن پہ دکھا ہاتھ
جو درد و الم تھا سو کہے تو کہ وہیں تھا
نام آج کوئی یاں نہیں لیتا ہے اُنہوں کا
جن لوگوں کے کل ملک پہ سب زیر نکبیں تھا
مسجد میں امام آج ہوا آ کے وہاں سے
کل تک تو یہی سیر خرابات نشین تھا

لطف اگر یہ ہے بتاں صندل پریشانی کا
حسن کیا صبح کے بھر چہرہ نورانی کا
کفر کچھ چاہئے اسلام کی رونق کے لئے
حسن زنا ہے تسبیح سلیمانی کا
درہمی حال کی ہے سارے مرے دیواں میں
سیر کر تو بھی یہ مجسوعہ پریشانی کا
جان گہیرانی ہے اندوہ سے تن میں کیا کیا
تلک احوال ہے اس یوسف زندانی کا
کہیل لڑکوں کا سمجھتے تھے محبت کے نہیں
ہے بڑا حیف ہمیں اپنی بھی نادانی کا
اُس کا منہ دیکھ رہا ہوں سو وہی دیکھوں ہوں
نقش کا سا ہے سنان میری بھی حیرانی کا

بت پرستی کو تو اسلام نہیں کہتے ہیں
معتقد کون ہے میرا ایسی مسلمان کا

جامۂ ہستی عشق اپنا مگر کم گھیرا
دامن تر کا مرے دریا ہی کا سا پھیرا
دیر میں کعبہ کیا میں خانقہ سے ابکی بار
راہ سے مے خانے کی اُس راہ میں کچھ پھیرا
بہلولوں نے کیا گل افشاں میر کا مرقد کیا
دور سے آیا نظر تو پھولوں کا یک ڈھیر تھا

اس عہد میں الہی صحبت کو کیا ہوا
چھوڑا وفا کو اُن نے مروت کو کیا ہوا
امیدوار وعدہ دیدار مر چلے
آتے ہی آتے یارو قیامت کو کیا ہوا
بخشش نے مجھ کو ابر کرم کی کیا خنجر
اے چشم جوش اشک ندامت کو کیا ہوا
جانا ہے یار تیغ بکف غیر کی طرف
اے کشتۂ ستم تری غیرت کو کیا ہوا

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا
جگرہی میں یک قطرہ خوں ہے سرشک
پلک تک کیا تو غلام کیا

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بيماری دل نے آخر کام تمام کیا
عہد جوانی رو رو کاٹا پوری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
 چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبت بد نام کیا
 کس کا کعبہ کیسا قبلۂ کون حرم ہے کیا احرام
 کوچے کے اُس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا
 یاں کے سپیٹ و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
 رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا
 میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو اُن نے تو
 قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

چمن میں گل نے جو گل دعوئے جمال کیا
 جمال یار نے منہ اُس کا خوب لال کیا
 بہار رفتہ بہار آئی ترے تماشے کو
 چمن کو یمن قدم نے ترے نہال کیا
 لگا نہ دل کو کہیں کیا سنا نہیں تو نے
 جو کچھ کہ میر کا اُس عاشقی نے حال کیا

منعم نے بنا ظلم کی رکھ گھر تو بنایا
 پر آپ کوئی رات ہی مہمان رہے گا
 چھوٹوں کہیں ایذا سے لگا ایک ہی جلا
 تا حشر مرے سر پہ یہ احسان رہے گا
 چمٹے رہیں گے دشت محبت میں سرو تیغ
 محشر تئیں خالی نہ یہ میدان رہے گا
 جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہو گز
 تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

جس سو کو غیرو آج ہے یاں تا جوڑی کا
 کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لقا راہ میں یاں ہر ستری کا
زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفته سری کا
ہر زخم جگر داور محشر سے ہمارا
انصاف طلب ہے تری بیداد گری کا
اپنی تو جہاں آنکھ لڑی پھر وہیں دیکھو
آنکھ کو لپکا ہے پریشان نظری کا
صد موسم گل ہم کو تہ بال ہی گزرے
مقدور نہ دیکھا کبھو بے بال پری کا
تک میور جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسہ ہے چراغ سحری کا

ملہ نکاہی کرے یہ جس جس کا
حیرونی ہے یہ آئینہ کس کا
شام سے کچھ بچھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مجلس کا
تے بڑے مہنچوں کے تیور لیک
شیخ مے خانے سے بھلا کھسکا
فیض اے ابر چشم تر سے اُٹھا
آج دامن وسیع ہے اس کا
تاب کس کو جو حال میور سنے
حال ہی اور کچھ مجلس کا

دعویٰ کیا تھا گل نے تیرے رخ سے باغ میں
سیلی لگی صبا کی سو منہ لال ہو گیا

پوٹھا ستم کا جس نے اُس باغ میں لگایا
 اپنے کٹے کا اُس نے نعرہ شتاب دیکھا
 آباد جس میں ٹھہر کر دیکھا تھا ایک مدت
 اُس دل کی مملکت کو اب ہم خواب دیکھا
 لیتے ہی نام اُس کا سوتے سے چونگ اُٹھا
 ہے خیر میو صاحب کچھہ تم نے خواب دیکھا

مر رہتے جو گل بن تو سارا یہ خلل جاتا
 نکلا ہی نہ جی ورنہ کا نٹا سا نکل جاتا
 میں کوئی خونی کو روکے ہی رہا ورنہ
 ایک دم میں زمانے کا ہاں رنگ بدل جاتا
 بن پوچھ کرم سے وہ جو بخش نہ دیتا تو
 پدرسش میں ہمارے ہی دن حشر کا قہل جاتا

مانند شمع مجلس شب اشکبار پایا
 القصہ میو کو ہم بے اختیار پایا
 احوال خوش انہوں کا ہم بزم ہیں جو تیرے
 افسوس ہے کہ ہم نے واں کا نہ باز پایا
 شہر دل ایک مدت اجڑا بسا عسوں میں
 آخر اُجڑا دینا اُس کا قرار پایا
 اتنا نہ دل سے ملتے ناول کو کہہ کے روتے
 جیسا کیا تھا ہم نے ویسا ہی پایا
 کیا اعتبار ہاں کا پھر اُس کو خوار دیکھا
 جس نے جہاں میں آکر کچھہ اعتبار پایا
 آہوں کے شعلے جس جا اُٹھے ہیں میو سے شب
 واں جا کے صبح دیکھا مشیت غبار پایا

یا روے یا دلایا اپنی تو یوں ہی گزری
 کیا ذکر ہم صنیوان یاران شادمان کا
 قید قفس میں ہیں تو خدمت ہے نالگی کی
 گلشن میں تھے تو ہم کو منصب تھا روضہ خواں کا
 پوچھو تو میو سے کیا کوئی: نظر پڑا ہے
 چہرہ اتر رہا ہے کچھ آج اُس جوان کا

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
 دل ستم زدہ کو ہٹے تھام تھام لیا
 مرے سلیقے سے میری نبی محبت میں
 تمام عمر میں ناگامیوں سے کام لیا
 اگرچہ گوشہ گزیں ہوں میں شاعروں میں میو
 یہ میو شور نے روے زمیں تمام لیا

سیر کے قابل ہے دل صد پارہ اُس نخچیر کا
 جس کے ہر تکرے میں ہو پیوست پیکان تیر کا
 سب کھلا باغ جہاں الا وہ حیران و خفا
 جس کو دل سجدے تھے ہم سوغندہ تھا تصویر کا
 کیونکہ نقاش ازل نے نقش ابرو کا کیا
 کام ہے اک تیرے بلند پر کھینچنا شمشیر کا
 رنگزور سیل حوادث کا ہے بے بنیاد دھر
 اس خرابے میں نہ کرنا فکر تم تعبیر کا
 بس طہیب اُتھ جائے بالیں سے مت دے درد سر
 کام یاں آخر ہوا اب فائدہ تدبیر کا
 کس طرح سے مانتے یارو کہ یہ عاشق نہیں
 رنگ اُڑ جاتا ہے تک چہرہ تو دیکھو میر کا

موجیں کرے ھے بکھر جہاں میں ابھی تو تو
 جانے گا بعد مہر کہ عالم حباب تھا
 اُگتے تھے دست بلبل و دامان گل بہم
 صحن چمن نمونہ ہوم الحساب تھا
 تک دیکھہ آنکھیں کھول کے اس دم کی حسرتیں
 جس دم یہ سوچے گی کہ یہ عالم بھی خواب تھا

گل کو مستحسب میں قیاس کیا
 فرق نکلا بہت جو باس کیا
 دل نے ہم کو مثال آئینہ
 ایک عالم کا روشناس کیا
 کچھ نہیں سوچتا سمیں اُس بن
 شوق نے ہم کو بے حواس کیا
 صبح تک شمع سر کو دھلتی رہی
 کیا پتنگے نے التماس کیا
 ایسے وحشی کہاں ہیں اے خوباں
 میسر کو تم عبث اُداس کیا

داغ فراق و حسرت وصل آرزوئے شوق
 میں ساتھ زہر خاک بھی ہڈیاں ملے گیا

اے تو کہ یہاں سے عاقبت کار جائے گا
 غافل نہ رہ کہ قافلہ یکبار جائے گا
 موقوف حشر پر ھے سواتے بھی وے نہیں
 کب درمیاں سے وعدہ دیدار جائے گا
 آنے میں اُس کے حال ہوا جائے ھے تغیر
 کیا حال ہوگا پاس سے جب تار جائے گا

جو سنا ہشیار اس مے خانے میں تھا بے خبر
 شوق ہی باقی رہا ہم کو دل آگاہ کا
 باندہ مترونے کا تار اے ناقداحت فہم چشم
 اس سے پایا جائے ہے سررشتہ جی کی چاہ کا

ہے اس کے حرف زہر لہی کا سبھوں میں ذکر
 کیا بات تھی کہ جس کا یہ بستان ہو گیا

ہم خستہ دل ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر
 تیوری چڑھائی تو نے کہ یاں جی نکل گیا
 گرمی عشق مانع نشو و نما ہوئی
 میں وہ نہال تھا کہ آگ اور جل گیا
 مستی میں چہرہ دیر کو کعبے چلا تھا میں
 لغزش بڑھی ہوئی تھی ولیکن سنبھل گیا

ملا ہے خاک میں کس کس طرح کا عالم یاں
 نکل کے شہر سے تک سیر کر مزاروں کا
 توپ کے مرنے سے دل کے کہ مغفرت ہو اُسے
 جہاں میں کچھ تو رہا نام بے قراروں کا
 توپ کے خرمن گل پر کہیں گراے بجلی
 جلانا کیا ہے مرے اشیاء کے خاروں کا
 تمہیں تو زہد و ورع پر بہت ہے اپنے غرور
 خدا ہے شیخ جی ہم بھی گنہگاروں کا

گزر ابنائے چرخ سے نالہ پگاہ کا
 خانہ خراب ہو جیو اس دل کی چاہ کا
 آنکھوں میں جی مرا ہے ادھر دیکھتا نہیں
 مہرتا ہوں میں تو ہاے دے صرفہ نگاہ کا

یک قطرہ خون حقو کے پاک سے ٹپک پڑا
 قصہ یہ کچھ ہوا دل غبراں پفاہ کا
 بدنام و خوار و زار و نزار و شکستہ حال
 احوال کچھ نہ ہو چھوٹے اس روسیاء کا
 ظالم زمیں سے لوٹتا دامن اُٹھا کے چل
 ہوگا کہیں میں ہاتھ کسو داد خواہ کا
 اے تاج شد نہ سر کو فرو لاؤں تیرے پاس
 ہے معتقد فقیر نمد کی کلاہ کا

دل سے شوقِ رخ نکو نہ گیا
 جہانکدہ ناکدہ کبھو نہ گیا
 ہر قدم پر تھی اُس کی منزل لیک
 سر سے سودائے جستجو نہ گیا
 سب گئے ہوش و صبر و تاب و توان
 لیکن اے داغ! دل سے تو نہ گیا
 دل میں کتنے مسودے تھے ولے
 ایک پیش اُس کے روبرو نہ گیا
 سبکدہ گرداں ہی میرِ غم تو رہے
 دست کوتاہ تا سب تو نہ گیا

دم صبح بزمِ خوش جہاں شبِ غم سے کم نہ تھی مہرباں
 کہ چراغ تھا سو تو دور تھا جو پتنگ تھا سو غبار تھا
 دل خستہ جو لہو ہو گیا تو بھلا ہوا کہ کہاں تلک
 کبھو سوزِ سینہ سے داغ تھا کبھو دردِ غم سے فگار تھا
 دل مضطرب سے گزر گئی شبِ وصل اپنی ہی فکر میں
 نہ دماغ تھا نہ فراغ تھا نہ شکیب تھا نہ قرار تھا
 یہ تمہاری آن دنوں دوستانِ مژدہ جس کے غم میں ہے خون چکان
 وہی آفتِ دل عاشقانِ کسو وقت ہم سے بھی یار تھا

نہیں تازہ دل کی شکستگی یہی درد تھا یہی خستگی
اسے جب سے ذوق شکار تھا اُسے زخم سے سروکار تھا
کبھو جائے گی جو ادھر صبا تو یہ کہیو اُس سے کہ بے وفا
مگر ایک میسر شکستہ پا ترے باغ تازہ میں خار تھا

مہر کی تجھ سے توقع تھی ستمگر نکلا
موم سمجھے تھے ترے دل کو سو پتھر نکلا
اشک تر قطرہ خوں لخت جگر پارہ دل
ایک سے ایک عدو آنکھ سے بہتر نکلا
ہم نے جانا تھا لکھے گا تو کوئی حرف اے میسر
پر ترا نامہ تو اک شوق کا دفتر نکلا

پھوڑا سا ساری رات جو پکتا رہے گا دل
تو صبح تک تو ہاتھ لگایا نہ جائے گا
اب دیکھ لے کہ سیلہ بھی تازہ ہوا ہے چاک
پھر ہم سے اپنا حال دکھایا نہ جائے گا
گو بے ستون کو تالے آگے سے کڑھکن
سنگ گران عشق اٹھایا نہ جائے گا
یاد اُس کی اتنی خرب نہیں میسر باز آ
نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

دنیوی کی نہ کر تو خواستگاری
اس سے کبھو بہرہ ور نہ ہو گا
آخانہ خرابی اپنی مت کر
کتبہ ہے یہ اس سے کھر نہ ہو گا

مت رنجہ کر کسی کو کہ اپنے تو اعتقاد
دل ڈھالے کر جو کعبہ بنایا تو کیا ہوا

میں صید نہ تو اُس ہوں تجھے کیا کروں گا یاد
ظالم ایک اور تیر لگایا تو کیا ہوا
کیا کیا دعائیں مانگی ہیں خلوت میں شیخ یوں
ظاہر جہاں سے ہاتھ اُٹھایا تو کیا ہوا
وہ فکر کر کہ چاک چکر پائے التیام
ناصر جو تونے جامہ سلایا تو کیا ہوا
جیتے تو میر اُن نے مجھے داغ ہی دکھا
پھر گور پر چراغ جلایا تو کیا ہوا

دل جو تھا اک آبلہ پھوٹا گیا
رات کو سینہ بہت کوتا گیا
میں نہ کہتا تھا کہ منہ کر دل کی اور
اب کہاں وہ آئینہ ٹوٹا گیا
دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا
میر کس کو اب دماغ کشنگو
عمر گزری دیکھتے چھوٹا گیا

اے دوست کوئی مجھے سا رسوا نہ ہوا ہو گا
دشمن کے بھی دشمن پر ایسا نہ ہوا ہو گا
تک گور غریباں کی کر سیر کہ دنیا میں
ان ظلم رسیدوں پر کیا کیا نہ ہوا ہو گا
اس کہلے خرابی میں آبادی نہ کر منعم
ایک شہر نہیں یاں جو صحرا نہ ہوا ہو گا
آنکھوں سے تری ہم کو ہے چشم کہ اب ہووے
جو فتنہ کہ دنیا میں برپا نہ ہوا ہو گا
جز مرتبہ کل کو حاصل کرے ہے آخر
یک قطرہ نہ دیکھا جو دریا نہ ہوا ہو گا

حق ڈھونڈنے کا آپ کو اتنا نہیں ورد نہ
عالم ہے سدھی یار کہاں یار نہ پایا
مربوط ہیں تجھ سے بھی یہی ناکس و نا اہل
اس باغ میں ہم نے کل بے خار نہ پایا

خواہ مجھ سے لڑ گیا اب خواہ مجھ سے مل گیا
دیا کہوں اے ہم نشیں میں تجھ سے حاصل دل گیا
دل سے آنکھوں میں لہو آتا ہے شاید رات کو
کش مکش میں بے قراری کی یہ پھوڑا چہل گیا
اپنے ہی دل کو نہ ہو واشد تو کیا حاصل نسیم
گو چمن میں غمچہ پڑمردہ مجھ سے کھل گیا
رشک کی جاگہ ہے مرگ اُس کشتہ حسرت کی میو
نعش کے ہمراہ جس کی گور تک قاتل گیا

دشمنی ہم سے کی زمانے نے جو جفا کار تجھ سا یار کیا
یہ تو ہم کا کارخانہ ہے یاں دھی ہے جو اعتبار کیا
مدرگ جاں کو تاب دے باغم تیری زلفوں کا ایک تار کیا
ہم فقیروں سے بے ادائی کیا آن بیتے جو تم نے پیار کیا
سخمت کافر تھا جس نے پہلے میو مذہب و عشق اختیار کیا

دو دن کئے کہ آنکھیں دریا سی بہتیاں تھیں
سوکھا پڑا ہے اب تو مدت سے یہ دو آبا
ان صحبتوں میں آخر جانیں ہی جاتھاں ہیں
نے عشق کو ہے صرفہ نے حسن کو محابا

قطعہ

آئی نظر جو گور سلیمساں کی ایک روز
لوہے پر اُس مزار کے تھا یہ رقم ہوا

گائے سر کشاں! جہاں میں کھینچا تھا میں بھی سر
 پایاں کار سورا کی خاک قدم ہوا
 کیا کیا عزیز دوست ملے میرے خاک میں
 نادان یاں کسو کا کسو کو بھی غم ہوا

دل و دماغ ہے اب کس کو زلف گانی کا
 جو کوئی دم ہے تو افسوس ہے جوانی کا
 اگرچہ عمر کی دس دن ہے اب رہ خاموش
 سخن رہے گا سدا میری کم زبانی کا
 ہزار جان سے قربان ہے پری کے میں
 خیال بھی کبھی گزرا نہ پرفشانی کا
 نمود کر کے وہیں بکھر غم میں بیتہ گیا
 کہے تو میر بھی یک بلبلا تھا پانی کا

بتوں کے عشق نے ہے اختیار کر ڈالا
 وہ دل کہ جس کا خدائی میں اختیار رہا
 وہ دل کہ شام و سحر جیسے پکا پھوڑا تھا
 وہ دل کہ جس سے ہمیشہ جگر فکار رہا
 نسام عمر گئی اس پہ ہاتھ رکھتے ہمیں
 وہ درد ناک علی الزعم ہے قرار رہا
 ستم میں غم میں سر انجام اُس کا کیا کہئے
 ہزاروں جسرتیں تھیں تسبیح جی کو مار رہا
 بہا تو خون ہو آنکھوں کی راہ بہ نکلا
 رہا جو سہلے سوزاں میں داغدار رہا
 سو اُس کو ہم سے فراموش کاریوں لے گئے
 کہ اس سے قطرۂ خوں بھی نہ یاد کار رہا
 گلی میں اُس کے گیا سو کیا نہ بولا پھر
 میں میر میر کر اُس کو بہت پکار رہا

جیتے جی کوچہ دلدار سے جایا نہ گیا
 اُس کی دیوار کا سر سے مرے سایہ نہ گیا
 دل کے تیں آتش ہجراں سے بچایا نہ گیا
 گھر جلا سا لہجہ پر ہم سے بچایا نہ گیا
 دل میں رہ دل میں کہ معیار قضا ہے اب تک
 ایسا مطبوع مکان کوئی بنایا نہ گیا
 کیا تاک حوصلہ تھ دیدہ و دل اپنے آہ
 ایک دم راز محبت کا چھپایا نہ گیا
 دل جو دلدار کا قاتل کے بہت بھوکا تھا
 اس ستم کشتہ سے یک زخم بھی کھایا نہ گیا
 شہر دل آہ عجب چاے تھی پر اُس کے گئے
 ایسا اُجڑا کہ کسی طرح بسایا نہ گیا
 سر نشیں رہ مے خانہ ہوں میں کیا جانوں
 رسم مسجد کے نکلیں شیخ کہ آیا نہ گیا

گریباں سے رہا کونہ تو پھر ہے
 تمہارے ہاتھ میں دامن ہمارا
 بلا جس چشم کو کہتے ہوں مردم
 وہ ہے نین بلا مسکن ہمارا
 ہوا رونے سے راز دوستی فاش
 ہمارا گر یہ تھا دشمن ہمارا
 کیا تھا ریختہ پردہ سخن کا
 سو تھیرا ہے یہی اب فن ہمارا

گلیوں میں اب تاک بھی مذکور ہے ہمارا
 افسانہ محبت مشہور ہے ہمارا
 مقصود کو تو دیکھیں کب تک پہنچتے ہیں ہم
 بالفعل اب ارادہ ناگور ہے ہمارا

ہیں مشتخاف لیکن جو کچھ ہمیں میرز ہم نہیں
مقدور سے زیادہ مقدور ہے مسارا

ابتداے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا
قافلے میں صبح کے اک شور ہے
یعنی غافل ہم چلے سوتا ہے کیا
سوز دھوتی ہی نہیں یہ سوز میں
تخم خواہش دل میں تو بوٹا ہے کیا
یہ نشان عشق ہیں جاتے نہیں
داغ چھاتی کے عبث دھوتا ہے کیا
غیرت یوسف ہے یہ وقت عزیز
میر اس کو رائیگاں کھوتا ہے کیا

ہم نہ کہتے تھے کہ میت دیر و حرم کی راہ چل
اب یہ دعویٰ حشر تک شیخ و برہمن میں رہا

رنگ از چہ چمن میں گلوں کا تو کیا نسیم
ہم کو تو روزگار نے بے بال و پر کیا
نافع جو تھیں مزاج کو اول سو عشق میں
آخر اُنہیں دواؤں نے ہم کو ضرر کیا
کیا جانوں بزم عیش کہ ساقی کی چشم دیکھ
میں صدمہ شراب سے آگے سحر کیا
جسدم کہ تیغ عشق کھچی بوالہوس کہاں
سن لپکتے کہ ہم ہی نے سینہ سپر کیا
وہ دشت خوف ناک رہا ہے مرا وطن
سن کر جسے خضر نے سفر سے حذر کیا

شاہد سے تیرے اگر میں ناتواں مارا گیا
 سب کہیں گے یہ کہ کیا؟ ک نہیں مارا گیا
 کہ گازیہ بیش کچھہ نقصان نہ آیا اُس کے تئیں
 اور میں بے چارہ توائے مہرباں مارا گیا
 وصل و ہجران سے جو در منزل ہیں راہ عشق کی
 دل فریب آن میں خدا جانے کہاں مارا گیا
 جس نے سر نہیمنچا دیار عشق میں اے بوالہوس
 رہ سراپا آرزو آخر جوان مارا گیا

اشک آنکھوں میں کم نہیں آتا لہو آتا ہے جب نہیں آتا
 ہوش جاتا نہیں رہا لیکن جب وہ آتا ہے تب نہیں آتا
 صبر تھا ایک مونس ہجران سو وہ مدت سے اب نہیں آتا
 دل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش گر یہ کچھہ ہے سبب نہیں آتا
 عشق کو حوصلہ ہے شرط ارند بات کا کس کو ڈھب نہیں آتا
 جی میں کیا کیا ہے اے ہمدم پر سخن تا بلب نہیں آتا

سحر کہ عید میں دور سجدو تھا
 پیراپے جام میں تجھے بن لہو تھا
 غلط تھا آپ سے غافل گزرتا
 نہ سمجھے ہم کہ اس قالب میں تو تھا
 چمن کی وضع نے ہم کو کیا داغ
 کہ ہر غنچہ دل پر آرزو تھا
 گل و آئینہ کیا خورشید و مہ کیا
 جدھر دیکھا تدر تیرا ہی رو تھا
 کرو گے یاد باتیں تو کہو گے
 کہ کوئی رفتہ بسیار گو تھا
 جہاں پر ہے فسانے سے ہمارے
 دماغ عشق ہم کو بھی کبھو تھا

مگر دیوانہ تھا گل بھی کسو کا
 کہ پیراھن میں سو جاگہ رفو تھا
 نہ دیکھا میرا آوارہ کو لیکن
 غبار اک ناتواں سا کو بکو تھا

وہ طلب میں گرے غرقِ سر کے بل ہم بھی
 شکستہ پائی نے اپنی ہمیں سنبھال لیا

نہ وے زنجیر کے غل ہیں نہ وے چر کے غزالوں کے
 مرے دیوانِ پین تک ہی رہا معمور ویرانا
 مرا سرنوچ میں زانوں پہ دکھ کر یوں لگا کھنکے
 کہ اے بیمار میرے تجھے پہ جلد آساں تو مرجانا
 نہ ہو کیوں ریختہ بے شورش و کیفیت و معنی
 گیا ہو میرا دیوانا رہا سودا سو مستانا

قدر دکھتی نہ تھی متاعِ دل
 سارے عالم کو میں دکھا لایا
 دل کہ یک قطرہ خون نہیں ہے بیش
 ایک عالم کے سر بلا لایا
 لب پہ جس بار نے گرانی کی
 اس کو یہ ناتواں اُتھا لایا
 دل مجھے اُس گلی میں لہجاکر
 اور بھی خاک میں ملا لایا

ابتدا ہی میں مر گئے سب یار
 عشق کی کون انتھا لایا
 اب تو جاتے ہیں بتکدے سے میر
 پھر ملیں گے اگر خدا لایا

یک وہم سی دہی ہے اپنی نمود تن میں
 آتے ہواب تو آؤ پھر ہم میں کیا رہیگا
 مذکور یار ہم سے مت ہم نشیں کیا کر
 دل جو بجا نہیں ہے پھر اس میں جا رہیگا

تفصص فائدہ ناصح! تدارک تجھ سے کیا ہوگا
 وہی پاوے گا میرا درد دل جس کا لگا ہوگا
 معیشت ہم فقیروں کی سی اخوان زمان سے کر
 کوئی گالی بھی دے تو کہہ بھلا بھائی بھلا ہوگا
 قیامت کر کے اب تعبیر جس کو کرتی ہے خلقت
 وہ اس کو چے میں اک آشوب سا شاید ہوا ہوگا
 کہیں ہیں میر کو مارا گیا شب اُس کے کو چے میں
 کہیں وحشت میں شاید بیٹھے بیٹھے اُٹھ گیا ہوگا

اپنے تزیے کی میں تدبیر پہلے کرلوں
 تب فکر میں کروں گا رخصتوں کو بھی رفو کا
 یہ عیش گہ نہیں ہے یاں رنگ اور کچھ ہے
 ہر گل ہے اس چمن میں ساغر بھرا لہو کا
 بلبل غزل سرائی آگے ہمارے مت کر
 سب ہم سے سیکھتے ہیں انداز گفتگو کا

سب سے مل چل کہ حادثہ ہے پھر
 کہیں نہ ہوندا بھی تو نہاٹے گا
 کہئے گا اُس سے قصہ مجنوں
 یعنی پردے میں غم سنائیے گا
 شرمک شیش و برہمن سے میر
 کعبہ و دیر سے بھی جائیے گا

اپنی دیوہ ایذت کی جدی مسجد
کسی ویرانے میں بنائے گا

دل پہنچا شلا کی کو نیت کھینچ کسالا
لے یار مرے سلمہ اللہ تعالیٰ
کچھ میں نہیں اس دل کی پریشانی کا باعث
برہم ہی مرے ہاتھ لگا تھا یہ رسالا
معسور شرابوں سے کہا بوں سے ہے سب دیر
مسجد میں ہے کیا شیخ کا پیالہ نہ نوالا
گزرے ہے لہو واں سرھر خار سے اب تک
جس دشت میں پھوٹا ہے مرے پاؤں کا چھالا
جس گھر میں ہو جلوے سے تو نے چاندنی کافرش
واں چادر مہتاب ہے مکڑی کا سا چالا
دیکھ ہے مجھے دیدہ پر خشم سے وہ میر
میرے ہی نصیبوں میں تھا یہ زہر کا پیالا

شہرۂ عالم اسے یمن محبت نے کیا
دردنہ منجھوں ایک خاک افتادہ ویرانہ تھا
اک نگاہ آشنا کو بھی وفا کرتا نہیں
وا ہوئی مڑگاں کہ سیرۂ سیرۂ بیگانہ تھا
روز و شب گزرے ہے پیچ و تپ میں رشتے تجھے
اے دل صد چاک کس کی زلف کا توشانہ تھا
یاد آیا مے کہ اپنے روز و شب کی جائے باش
یا در باز بیاباں یادار میخانہ تھا
غیر کے نکھنے سے مارا اُن نے ہم کو بے گذا
یہ نہ سمجھا وہ کہ واقع میں بھی تھا یا کچھ نہ تھا
شب فروغ بزم کا باعث ہوا تھا حسن دوست
شمع کا جلوہ غبار دیدہ پروانہ تھا

شریف مکہ رہا ہے تمام عمر اے شیخ
یہ میر اب جو گدا ہے شراب خانے کا

دیر و حرم سے گزرے اب دل ہے گھر ہمارا
ہے ختم اس آبلے پر سیر و سفر ہمارا
دنیا و دیں کی جانب میلان ہو تو کہئے
کیا جائے کہ اُس بن دل ہے بدھڑ ہمارا
جوں صبح اب کہاں ہے طول سخن سے فرصت
قصہ ہی کوئی دم کو ہے مختصر ہمارا
کوچے میں اُس کے جاگر بنتا نہیں پھر آنا
خون ایک دن کرنے کا اس خاک پر ہمارا

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
دل کے جانے کا نہایت غم رہا
حسن تھا تیرا بہت عالم فریب
خط کے آنے پر بھی اک عالم رہا
جامۂ احرام زائد پر نہ جا
تھا حرم میں لیک نہ متحرم رہا
میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی
ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا
صبح پوری شام ہونے آئی میری
تو نہ چیتا یاں بہت دن کم رہا

ہر حرف غم نے میرے مجلس کے تئیں دلایا
گویا غبار دل کا پڑھتا کتاب نکلا
آیا جو واقعے میں درپیش عالم مرگ
یہ جاگتا ہمارا دیکھا تو خواب نکلا

چوری میں دل کی وہ ہنر کر گیا
 دیکھتے ہی آنکھوں میں گھر کر گیا
 دھر میں میں خاک بسر ہی رہا
 عمر کو اس طور بسر کر گیا
 کس کو مرے حال سے تھی آگہی
 نالہ شب سب کو خبر کر گیا
 مجلس آفاق میں پروانہ ساں
 میز بھی شام اپنی سحر کر گیا

سرسری تم جہان سے گزرے
 ورنہ ہر جا جہان دیگر تھا
 دل کی کچھ قدر کرتے رہیو تم
 یہ ہمارا بھی ناز پرور تھا
 بارے سجدہ ادا کیا تم نوٹ
 کب سے یہ پوچھ میرے سر پر تھا
 اب خرابہ ہوا جہاں آباد
 ورنہ ہر ایک قدم پہ یاں گھر تھا

قطعہ

بے زری کا نہ کر گلہ غافل
 اتنے ملمع جہان میں گزرے
 صاحب جاہ و شوکت و اقبال
 تھی یہ سب کائنات زیر نگین
 لعل و یاقوت و ہم زرد گوہر
 آخر کار جب جہاں سے گیا
 عیب طول کلام مت کریو
 خوش رہا جب تلک رہا جیتنا
 رہا نسلی کہ یوں مقدر تھا
 وقت رحلت کسی کلمے زر تھا
 یک ازاں جملہ اب سکندر تھا
 ساتھ مور و ملخ سا لشکر تھا
 چاہئے جس قدر میسر تھا
 ساتھ خالی کفن سے باہر تھا
 کیا کروں میں سخن سے خوگر تھا
 میر معلوم ہے قلندر تھا

مانیبت دو عالم کھاتی پھرتے غوطے
 یک قطرہ رگوں یہ دل کا طوفان ہے ہمارا
 کیا خاندان کا اپنے تجھ سے کہیں تقدس
 روح القدس اک ادنیٰ دریاں ہے ہمارا
 دینا ہے نام وہ دل جو ثقل میں نہ آوے
 نہ یہ نہ مشیم کتنا نادان ہے ہمارا

سارے رئیس اعضا نہیں معرض تلف میں
 یہ عشق ہے سحابا کس کو امان دے گا
 پیارے پر آبلہ سے میں گم شدہ گیا ہوں
 غر خار بادیںے کا میرا نشان دے گا
 نالہ ہمارا غر شب گزرے ہے آسمان سے
 فریاد پر ہماری کس دن تو کان دے گا

کل چمن میں گل و سمن دیکھا
 آج دیکھا تو باغ بن دیکھا
 کیا ہے گلشن میں جو قفس میں نہیں
 عاشقوں کا جلا وطن دیکھا
 ذوق پیکان و تیر میں تیرے
 مدتوں تک جگر نے چہن دیکھا
 ایک چشمک دو صد سالان مڑے
 اس نکیلے کا بانک پن دیکھا
 حسرت اُس کی جگہ تھی خوابیدہ
 میر کا کھول کر کفن دیکھا

جہاں کو فتنے سے خالی کہہو نہیں پایا
 ہمارے وقت میں تو آفت زمانہ ہوا

خلش نہیں کسو خواہش کی رات سے شہید
 سر شک یاس کے پردے میں دل روانہ ہوا
 کھلا نشے میں جو پگڑی کا بچہ اُس کے میں
 سسند ناز پہ اک اور نازیبا ہوا

جی تو ایسے کئی صدقے کئے تجھ پر لیکن
 حیف یہ ہے کہ تاک تو بھی پیستیاں نہ ہوا
 آہ میں کب کی کہ سرمایہ دوزخ نہ ہوئی
 کونسا اشک مرا منبع طوفان نہ ہوا

قطعہ

گو توجہ سے زمانے کی جہاں میں مجھ کو
 جاہ و ثروت کا میسر سرو سامان نہ ہوا
 شکر صد شکر کہ میں ذلت و خواری کے سبب
 کسی عنوان میں ہم چشم تیزاں نہ ہوا

کیسا چمن کہ ہم سے اسیروں کو منع ہے
 چاک قنس سے باغ کی دیوار دیکھنا
 گر زمزمہ یہی ہے کوئی دن تو ہم صنیر
 اُس فصل ہی میں ہم کو گرفتار دیکھنا

زمین اک صفحہ تصویرِ بے ہوشاں سے مانا ہے
 یہ مجلس جب سے ہے اچھا نہیں کچھ رنگ صحبت کا
 جہاں جلوے سے اس محبوب کے یکسر لبالب ہے
 نظر پیدا کر اول پھر تماشا دیکھ قدرت کا
 خرابی دل کی اس حد ہے کہ یہ سمجھا نہیں جاتا
 کہ آبادی بھی پیاں تھی یا کہ ویرانہ تھا مدت کا

نگاہ مسست نے اُس کی لٹائی خانقہ ساری
پڑا ہے برہم اب تک کارخانہ زہد و طاعت کا

جو اُس شور سے میوے روتا رہے گا
تو غمساہ گاہ کو سوتا رہے گا
میں وہ رونے والا جہاں سے چلا ہوں
جسے ابر ہر سال روتا رہے گا
مجھے کام رونے سے اکثر ہے ناصح
تو کب تک مرے منہ کو دھوتا رہے گا
بس اے گریہ آنکھیں نری کیا نہیں ہیں
جہاں کو کہاں تک دے روتا رہے گا
مرے دل نے وہ نالہ پیدا کیا ہے
جس کا بھی جو ہوش کھوتا رہے گا
تو یوں گالیاں غیر کو شوق سے دے
ہمیں کچھ کہے گا تو ہوتا رہے گا
بس اے میر مڑگاں سے پونچھ آنسوؤں کو
تو کب تک یہ موتی پروتا رہے گا

دل عشق کا ہمیشہ حریف نبرد تھا
اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں آگے درد تھا

قطعہ

یاں بلبل اور گل پہ تو عبرت سے آنکھ کھول
گل گشت سرسری نہیں اس گلستان کا
گل یادگار چہرہ خوباں ہے بے خبر
مرغ حسن نشان ہے کسو خوش زبان کا

شیخ کیا صورتیں دھتی تھیں بھلا جب تھا دیر
 دو بویرانی ہو اس کعبے کی آبادی کا
 ریختہ رتبے کو پہنچایا ہوا ہے اس کا
 معتقد کون نہیں میر کی استادی کا

سعی طوف حرم نہ کی ہرگز
 آستان پر ترے مقام کیا
 تیرے کوچے کے دھننے والوں نے
 یہیں سے کعبے کو سلام کیا
 عشق خوبیاں کو میر میں اپنا
 قبلہ و کعبہ و امام کیا

طالع جو خوب تھے نہ ہوا جاہ کچھ نصیب
 سر پر مرے کروڑ برس تک ہما پہرا
 دیر و حرم میں کیوں کہ قدم رکھ سکے گا میر
 ایدھر تو اس سے بت پھرے اودھر خدا پہرا

خدا کو کام تو سونپے ہیں میں نے سب لیکن
 رہے خوف مجھے واں کی بے نیازی کا
 کسو کی بات نے آگے مرے نہ پایا رنگ
 دلوں میں نقش ہے میری سخن طرازی کا
 بسان خاک ہو پامال راہ خلق اے میر
 رکھے ہے دل میں اگر قصد سرفرازی کا

بزم عشرت میں بلا مت ہم نگوں بختوں کے تئیں
 جوں حباب بادۂ ساغر سر نگوں ہو جائے گا

کیا کہیے کہ خوبیاں نے اب ہم میں ہے کیا رکھا
 اُن چشم سیاہوں نے بہتوں کو سلا رکھا
 جلوہ ہے اُسی کا سب گلشن میں زمانے کے
 گل پھول کو ہے اُن نے پروا نہ بنا رکھا
 جوں برگ خزاں دیدہ سب زرد ہوئے ہم تو
 گرمی نے ہمیں دل کی آخر کو جلا رکھا

پوشیدہ راز عشق چلا جائے تھا سو آج
 بے طاقتی نے دل کی وہ پردہ اُٹھا دیا
 اس موج خیز دھر میں ہم کو قضائے آہ
 پانی کے بلبلے کی طرح سے مٹا دیا
 سب شور ما و من کو لئے سر میں مر گئے
 یاروں کو اس فسانے نے آخر سلا دیا
 آوارگان عشق کا پوچھا جو میں نشان
 مشیت غبار لے کے صبا نے اُڑا دیا
 تکلیف درد دل کی عبث ہم نشیں نے کی
 درد سخن نے میرے سبھوں کو دلا دیا

وصیت میر نے مجھے کو یہی کی
 کہ سب کچھ ہونا تو عاشق نہ ہونا

کی بعد مرگ یاد کروں گا وفا تجھ
 سہتا رہا جفا تیں میں جب تک چہا کیا

لذت سے نہیں خالی جانوں کا کہہا جانا
 کب خضر و مسیحک نے مرنے کا مڑا جانا
 تھا ناز بہت ہم کو دانست پر اپنی بھی
 آخر وہ برا نکلا ہم جس کو بھلا جانا

کہا پانی کے مول آکر مالک نے ہے گہر بیچا
 ہے سخت گراں سستا یوسف کا بکا جانا
 اے شور تھا مت ہم سوتے ہی نہ رہ جائیں
 اس راہ سے نکلے تو ہم کو بھی جگا جانا

عالم کی سیر میر کی صحبت میں ہو گئی
 طالع سے میرے ہاتھ یہ بے دست و پا لگا

حق تو سب کچھ ہی ہے تو ناحق نہ بول
 بات کہتے سر کٹا منصور کا
 بیچ سے کب کا گیا اب ذکر کیا
 اس دل مرحوم کا مغفور کا

قلمی

مر گئے پر خاک ہے سب کبر و ناز
 مت جھکو گو سر کسو مغرور کا
 تھیکری کو قدر ہے اُس کو نہیں
 تو تے جب کاسہ سر فغفور کا

یہ بھی طرفہ ماجرا ہے کہ اُسی کو چاہتا ہوں
 مجھے چاہئے ہے جس سے بہت احتراز کرنا

جس شعر پر سماع تھا کل خافقاہ میں
 وہ آج میں سنا تو ہے میرا کہا ہوا

بھرتا ہے زندگی کے لئے آہ خوار کیا
 اس وہم کی نوبت کا ہے اعتبار کیا

صحبت دہی بگڑتی ہی اس کیلہ ورے آ
ہم جانتے نہیں ہیں کہ ہوتا ہے پیار کیا

خیرت روئے گل سے مرغ چمن
چپ ے یوں بے زبان ہے گویا
مسجد ایسی بھری بھری کیا ہے
میکدہ اک جہان ہے گویا
وہی شور و مزاج شیب میں ہے
سیر اب تک جوان ہے گویا

عوش اُڑ گئے سمیوں کے شور سحر سے اُس کے
مرغ چمن اُگرچہ یک مشت بال و پر تھا
پھر آج یہ کہانی کل شب پر رہ گئی ہے
سوتا نہ رہتا تک تو قصہ ہی مختصر تھا
تھا وہ بھی اک زما فہ جب نالے آتشیں تھے
چاروں طرف سے جنگل جلتا دھڑ دھڑ تھا

اک نکتہ ایک چشمک ایک سخن
اس میں بھی تم کو ہے تامل سا
بار مستوں نے ہوشیاری کی
دے کے کچھہ محتسب کاملہ جہلسا

عشق نے کیا کیا تصرف یاں کئے ہیں آج کل
چشم کو پانی کیا سب دل کو سب لوہو کیا
کام میں قدرت کے کچھہ بولا نہیں جاتا ہے ہائے
خوب رو اُس کو کیا لیکن بہت بد خو کیا

یہ میر ستم کشتہ کسو وقت جوان تھا
انداز سخن کا سبب شور و فغان تھا
جادو کی پڑی پرچہ ابیات تھا اُس کا
ملہ تکتے غزل پڑھتے عجب سحر بیاں تھا
جس راہ سے وہ دل زدہ دلی میں نکلتا
ساتھ اُس کے قیامت کا سا ہنگامہ رواں تھا
افسردہ نہ تھا ایسا کہ جوں آب زدہ خاک
آندھی تھا بلا تھا کوئی آشوب جہاں تھا
غافل تھے ہم احوال دل خستہ سے اپنے
وہ گنج اسی گنج خرابہ میں نہاں تھا
گو میر جہاں میں کنہوں نے تجھ کو نہ جانا
موجود نہ تھا تو تو کہاں نام و نشان تھا

دل نہ تھا ایسی جگہ جس کی نہ سدا لیجئے کبھو
آجڑی اس بستی کو پھر تونے بسایا ہوتا
دل سے خوش طرح مکاں پھر بھی کہیں بنتے ہیں
اس عمارت کو تو تک دیکھ کے ڈھایا ہوتا

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو
دیر سے انتظار ہے اپنا
دوتے پھرتے ہیں ساری ساری رات
اب یہی روزگار ہے اپنا
دے کے دل ہم جو ہو گئے مجبور
اس میں کیا اختیار ہے اپنا
کچھ نہیں ہم مثال عنقالبیک
شہر شہر اشتہار ہے اپنا
جس کو تم آسمان کہتے ہو
سو دلوں کا غبار ہے اپنا

کجی اُس کی جو میں جتانے لگا
 مجھے سیدھیاں وہ سنانے لگا
 تکمیل نہ تھا جس کو تک سو وہ میں
 ستم کیسے کیسے اُتھانے لگا
 پریشاں ہیں اس وقت میں نیک و بد
 مورا جو کوئی وہ تھکانے لگا
 نہیں دھتے عاقل علاقے بغیر
 کہیں میر دل کو دوانے لگا

کچھ عشق و دوس میں فرق بھی کر
 کیدھر ہے وہ امتیاز تیرا
 کہتے نہ تھے میر مت کڑھا کر
 دل ہو نہ گیا گداز تیرا

آنسو مری آنکھوں میں ہو دم جو نہ آجانا
 تو کام مرا اچھا پردے میں چلا جاتا
 کہتے تو ہو یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آنا
 یہ کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا
 جو عشق نہیں ہے تو یہ کیا ہے بھلا مجھ کو
 جی خود بخود اے ہمدم کا ہے کو کہا جاتا

کوئی سادہ ہی اس کو سادہ کہے
 لگے ہے ہمیں تو وہ عیار سا
 صحبت ہے یا کوئی جی کا ہے روگ
 سدا میں تو دھتا ہوں بیچار سا
 مگر آنکھیں تیری بھی چپکی کہیں
 ٹپکتا ہے چتون سے کچھ پیار سا

وای احوال اُس جفا کش کا
 عاشقی اپنا جسے وہ جان گیا
 داغ چرماں ہے خاک میں بھی ساتھ
 جی گیا پر نہ یہ نشان گیا
 کل نہ آئے میں ایک یاں تیرے
 آج سو سو طرف گمان گیا
 دل سے مت جا کہ بھر وہ پیچھتایا
 ہاتھ سے جس کے یہ مکان گیا
 کون جی سے نہ جائے گا اے میر
 حیف یہ ہے کہ تو جوان گیا

کل میں کہا وہ طور کا شعلہ کہاں گرا
 دل نے جگر کی اور اشارت کی یاں گرا
 کیا کم تھا شعلہ شوق کا شعلے سے طور کے
 پتھر بھی واں کے جل گئے جا کر جہاں گرا

آتے ہی آتے تیرے یہ نا کام ہو چکا
 واں کام ہی رہا تجھے یاں کام ہو چکا
 ترپے ہے جب کہ سینے میں اچھلے ہے دو دو ہاتھ
 گر دل یہی ہے میر تو آرام ہو چکا

عجب ہم بے بصیرت ہیں کہاں کہولا ہے بار آکر
 یہاں سے لوگ سب رخت سفر کرتے ہیں بار اپنا
 نہ ہو یوں مکیدہ مسجد سا پر واں ہوش جاتے ہیں
 ہوا ہے دونوں جاگہ ایک دو بادی گزار اپنا
 سراپا آرزو ہم لوگ ہیں گاہے کورندوں میں
 دے ہیں اب تلک جیتے ولے دل مار مار اپنا

میر بھی دیر کے لوگوں ہی کی سی کہنے لگا
کچھ خدا لگتی بھی کہتا جو مسلمان ہوتا

پہلا قدم ہے انسان پامال مرگ ہونا
کیا جانے رفتہ رفتہ کیا ہو مآل تیرا
کچھ زرد زرد چہرہ کچھ لاغری بدن میں
کیا عشق میں ہوا ہے اے میر حال تیرا

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
درد و غم کٹے کٹے جمع تو دیوان کیا

پریشان ہوا دوستی کر کے میں
بہت مجھ کو ارمان تھا چاہ کا
اسیری کا دیتا ہے مژدہ مجھے
مرا زمزمہ گاہ و بے گاہ کا

چشم سے خوں ہزار نکلے گا
کوئی دل کا بخار نکلے گا

صاحب ہو مار ڈالو مجھے تم وگر نہ کچھ
جز عاشقی گناہ نہیں ہے غلام کا

ہر آن تھی سرگوشی یا بات نہیں گاہے
اوقات ہے اک یہ بھی اک وہ بھی زمانہ تھا
پامالی عزیزوں کی رکھنی تھی نظر میں تک
اتنا بھی تمہیں آکر یاں سر نہ اُتھانا تھا
اک محو تماشا ہیں اک گرم ہیں قصے کے
یاں آج جو کچھ دیکھا سو کل وہ فسانا تھا

کیونکر گلی سے اُس کی میں اُتہ کے چلا جاتا -
 یاں خاک میں ملنا تھا لوہو میں نہانا تھا
 کیا صورتیں بگڑی ہیں مشتاقوں کی ہجراں میں
 اُس چہرے کو اے خالق ایسا نہ بنانا تھا
 مت سہل ہمیں سمجھو پہنچے تھے بہم تب ہم
 برسوں تئیں گردوں نے جب خاک کو چھانا تھا
 کہتا تھا کسو سے کچھہ تکتا تھا کسو کا مذہ
 کل میسر کھڑا تھا یاں سچ ہے کہ دوانا تھا

دل جی کے اُلہجنے ہی کے جھگڑے میں کتے ھے
 رات اس کے خیالات سے دھتے ہیں قضا یا

تحقیق کروں کس سے حقیقت کے نشے کو
 خضر آب اسے کہتا ھے آتش کہے مذہ سے

دل نے کیا کیا نہ درد رات دے
 جیسے پکتا دھ کوئی پھوڑا
 کیا کرے سخت مدعی تھے بلند
 کوہ کن تو نے سر بہت پھوڑا
 دل ہی مرغ چسں کا توت گیا
 پھول گلچیں نے ہاے کیوں توڑا
 ھے لب بام آفتاب عمر
 کرپے سو کیا ھے میسر دن تھوڑا

ابرار جوش گل ھے چل خانقہ سے صوفی
 ھے لطف میکدے میں دہ چند اس ہوا کا

کیونکر بسر کرے غم و غصہ میں ہجر کے
 خوگر ہو جو کسو کے کوئی التفات کا
 واعظ کہے سو سچ ہے ولے سے فروش سے
 ہم ذکر بھی سنا نہیں صوم و صلوات کا
 عالم کسو حکیم کا باندھا طلسم ہے
 کچھ ہو تو اعتبار بھی ہو کائنات کا

تجافل تغافل تساهل کیا ہوا کام مشکل توکل کیا
 نہیں تاب لاتا دل زار اب بہت ہم نے صبر و تحمیل کیا
 زمین غول ملک سی ہو گئی یہ قطعہ تصرف میں بالکل کیا
 حقیقت نہ میرا اپنی سمجھی گئی شب و روز ہم نے تامل کیا

رفتہ عشق کیا ہوں میں اب کا
 جا چکا ہوں جہان سے کب کا
 لوگ جب ذکر یار کرتے ہیں
 دیکھ رہتا ہوں دیر منہ سب کا
 مست رہتا ہوں جب سے ہوش آیا
 میں بھی عاشق ہوں اپنے مشرب کا

دیکھا نہ ادھر ورنہ آتا نہ نظر پھر میں
 جی مفت مرا جاتا اُس شوخ کا کیا جاتا
 تھا میں بھی دیوانہ پر ساتھ ظرافت کے
 ہم سلسلہ داروں کی زنجیر ہلا جاتا

دل کو گل کہتے تھے درد و غم سے مرجھا یا گیا
 جی کو مہمان سنتے تھے مہمان سا آیا گیا
 جستجو میں یہ تعب کھینچی کہ آخر ہو گئے
 ہم تو کھوئے بھی گئے لیکن نہ کچھ پایا گیا

مکے گیا مدینے گیا کر بلا گیا
 جیسا گیا تھا ویسا ہی چل پھر کے آگیا
 دیکھا ہو کچھ اس آمد و شد میں تو میں کہوں
 خود گم ہوا ہوں بات کی تہ اب جو پا گیا

خرب کیا جو اہل کرم کے جود کا کچھ نہ خیال کیا
 ہم جو فتنہ ہوئے تو ہم نے پہلے ترک سوال کیا

بہار آئی چلو چمن میں ہوا کے اوپر بھی رنگ آیا
 کہاں تاک گلی نہ ہوئے غنچہ رہا موندے منہ سونگ آیا
 چہلے ہیں موندتے پیتے تھے کھنٹی چسے تھے چولی پہنستے تھے مہدی
 قیامت اس کی تھے تنگ پوشی ہمارا جی تو بتنگ آیا
 دھئی تھے رونا دھئی تھے کڑوا دھئی تھے شورش جوانی کی سی
 بڑھاپا آیا تھے عشق ہی میں یہ میسر ہم کو نہ ڈھنگ آیا

نے ہم سے کچھ نہ اُس ستم ایجاد سے ہوا
 ظلم صریح عشق کی امداد سے ہوا

دور بہت بھاگو ہو ہم سے سیکھے طریق غزالوں کا
 وحشت کرنا شبوہ تھے کچھ اچھی آنکھوں والوں کا

منہ اپنا کبھو وہ ادھر کر رہے گا
 ہمیں عشق تھے تو اثر کر رہے گا
 جو دلبر تھے ایسا تو دل جا چکا ہے
 کسو روز آنکھوں میں گھر کر رہے گا
 ہر اک کام موتوف تھے وقت پر ہی
 دل خوں شدہ بچی جگر کر رہے گا

سخن مشتاق ہے عالم ہمارا
 غنیمت ہے جہاں میں دم ہمارا
 رکے رہتے ہیں دل پر ہاتھ اے میر
 یہیں شاید کہ سب ہے غم ہمارا

ہر ورق ہر صفحے میں اک شعر شور انگیز ہے
 عرصہ مکشور کا عرصہ ہے میرے دیوان کا

عشق ہمارے خیال پر اے خواب گئی آرام کیا
 جی کا جانا تھیر رہا ہے صبح گیا یا شام گیا
 عشق گیا سر دین گیا ایمان گیا اسلام گیا
 دل نے ایسا کام کیا کچھ جس سے میں نا کام گیا
 ہاے جوانی کیا کیا کھڑے شور سڑوں میں رکھتے تھے
 اب کیا ہے وہ دہر گیا وہ موسم وہ ہنگام گیا

دھل میں رنگ اُڑ گیا میرا
 کیا جدائی کو منہ دکھاؤں گا

بعد ہمارے اس فن کا جو کوئی ماہر ہووے گا
 درد آگین انداز کی باتیں اثر پڑے پڑے کر دوے گا
 چشم تماشا وا ہووے تو دیکھا بھالی غنیمت ہے
 مت موندے آنکھوں کو غافل دیر تلک پھر سووے گا
 جست و جو بھی اُس کی کرے جس کا نشان کچھ پیدا ہو
 پانا اس کا میر ہے مشکل جی تو یو نہیں کہووے گا

جب زمزمہ کرتی ہے صدا چبھتی ہے دل میں
 بلبل سے کوئی سیکھ لے انداز سخن کا

اُس کی سی جو چلے ھے راہ تو کیا
 آسماں پر گیا ھے ماہ تو کیا
 کب رخ بدر روشن ایسا ھے
 ایک شب کا ھے اشتباہ تو کیا
 بے خرد خانقہ میں ھیں گو مست
 وہ کرے مست اک نگاہ تو کیا
 حسن والے ھیں کچھ روش سارے
 ھوے دو چار رو براہ تو کیا

سر مارنا پتھر سے یا تکرے جگر کرنا
 اس عشق کی وادی میں ھر نوح بسر کرنا

دل کے خوں ھونے کا غم کیا اب سے تھا
 سینہ کو بی سخت ماتم کب سے تھا

فلک نے بیس کر سرمہ بنایا
 نظر میں اُس کی میں تو بھی نہ آیا
 زمانے میں مرے شور جفوں نے
 قیامت کا سا حکامہ اُٹھایا
 قریب دیر خضر آیا تھا لیکن
 ہمیں رستہ نہ کعبے کا بتایا
 حق صحبت نہ طیلروں کا رہا یاد
 کوئی دو بھول اسیروں تک نہ لایا

موتے ہم جس کی خاطر بے وفا تھا
 نہ جانا اُن نے تو یوں بھی کہ کیا تھا
 معالج کی نہیں تقصیر ھرگز
 مرض ہی عاشقی کا لادوا تھا

نہ ملیو چاہنے والوں سے اپنے
 نہ جانے تجھ سے یہ کن نے کہا تھا
 پریشان کر گئی فریاد بلبل
 کسو سے دل ہمارا پھر لگا تھا
 ملے پرسوں وشی بیگانگی تھی
 ہمارے زعم میں وہ آشنا تھا
 نہ دیوانے تھے ہم سے قیاس و فرہاد
 ہمارا طور عشق ان سے جدا تھا
 صدم خانے سے آجہ کھینے گئے ہم
 کوئی آخر ہمارا بھی خدا تھا

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنئے گا
 پڑھتے کسو کو سنئے گا تو دیر تلک سر دھنئے گا
 سعی و تلاش بہت سی رہیگی اس انداز کے کہنے کی
 صحبت میں علما فضلا کی جا کر پڑھئے گئے گا

سائے میں تاک کے مجھے دکھا اسیر کر
 صیاد کے کرم سے قنس آشیاں ہوا
 ہم نے نہ دیکھا اُس کو سو نقصان جاں کیا
 ان نے جو اک نگاہ کی اُس کا زیاں ہوا
 وے تو کھڑے کھڑے مرے گھر آ کے پھر گئے
 میں بے دیار و بے دل و بے خا نسا ہوا

جو تو ہی صدم ہم سے بزار ہو گا
 تو جینا ہمیں اپنا دشواو ہو گا
 غم ہجر رکھے گا بیتاب دل کو
 ہمیں کڑھتے کڑھتے کچھہ آزار ہو گا

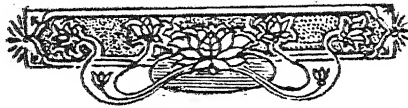
جو افراطِ اُلفت ہے ایسا تو عاشق
 کوئی دن میں برسوں کا بیسار ہوگا
 اُچھٹنی ملاقات کب تک رہے گی
 کبھو تو تہ دل سے بھی یار ہوگا
 تجھے دیکھ کر لگ گیا دل نہ جانا
 کہ اس سنگدل سے ہمیں پیار ہوگا
 یہی ہوگا کیا ہوگا میسر ہی نہ ہونگے
 جو تو ہوگا بے یار و غمِ خوار ہوگا

رہے بد حال صوفی حال کرتے دیرِ مجلس میں
 مغنی سے سنا مصرع جو میرے شعرِ حالی کا
 نظر پھر دیکھتا کوئی تو تم آنکھیں چھپا لیتے
 سماں اب یاد ہوگا کب تمہیں وہ خورد سالی کا
 چمک یا قوت کی چلتی ہے اتنی دور کا ہے کو
 اچنبھا ہے نظر بازوں کو ان ہونٹوں کی لالی کا
 دماغ ایذا تو اپنی فکری میں ہو چکا یکسر
 خیال اب کس کو ہے اے ہمنشین نازک خیالی کا

سخن مشتاق ہے عالمِ ہمارا
 بہت عالم کرے گا غمِ ہمارا
 پوچھیں گے شعرِ دو دو لوگ بیتھے
 رہے گا دیر تک ماتمِ ہمارا
 نہیں ہے مرجعِ آدم اگر خاک
 کدھر جاتا ہے قد خمِ ہمارا
 زمیں و آسمان زیرِ وزیر ہے
 نہیں کم حشر سے ادھمِ ہمارا
 کسو کے بالِ درہم دیکھتے میسر
 ہوا ہے کامِ دلِ برہمِ ہمارا

جانا نہ تھا سرہا نے مجھہ مختصر کے ہائے
 کیا وقت رہ گیا تھا کہ وہ ملہ چہا گیا
 آشفتنہ سر میں سر و گریبان د ریدہ گل
 بیٹھا کہاں چمن میں کہ فتنہ اُٹھا گیا
 گل برگ سے بھرے تھے کہتے تو کڈا و جیب
 کیا کیا سہیں نہ گریۓ خونین دکھا گیا
 خط بھیج کے بھی شوق کی باتیں چلی گئیں
 قاصد کے پیچھے دور ملک میں لگا گیا
 روتا ہوں یوں کہ برسے ہے شدت سے جیسے مینہ
 جوں ابر میرے دل پہ غم عشق چھا گیا
 ہستی مری کہ ہیچ تہی میں منفعل رہا
 اس شرم سے ندان زمیں میں سماں گیا
 داغ دل خراب شبوں کو جلے ہے میر
 عشق اس خرابے میں بھی چراغ اک جلا گیا

شب کو وہ پئے شراب نکلا	جانا یہ کہ آفتاب نکلا
تربان پیالۂ سے ناب	جس سے کہ ترا حجاب نکلا
مجھہ بن جو پیا تھا قرطمے کا	آنکھوں سے ہو خون ناب نکلا
مستی میں شراب کی جودیکھا	عالم یہ تمام خواب نکلا
شیخ آتے تو میکدے میں آیا	پر ہو کے بہت خراب نکلا
یک جرۂ شراب ہی میں واعظ	ہر مستخرگی کا باب نکلا
تھا غیبت بادۂ عکس گل سے	جس جوے چمن سے آب نکلا



دردِ یفاب

شکوہِ عبت ہے میر کہ کڑھتے ہیں سارے دن
یا دل کا حال رہتا ہے درہم تمام شب
گزارا کسے جہاں میں خوشی سے تمام روز
کس کی کتنی زمانے میں ہے غم تمام شب

مت دھلک مڑگان سے اب تو اے سرشک آبدار
مفت میں جاتی رہے گی تیری موتی کی سی اب
کچھ نہیں بکھر جہاں کی موج پر مت بھول میر
دور سے دریا نظر آتا ہے لیکن ہے سراب

زدی رنگ ہے غم پوشیدہ پر دلیل
دل میں جو کچھ ہے منہ سے ہمارے عیاں ہے اب
برسوں ہوئے گئے اُسے پر بھولتا نہیں
پادش بخیر میر رہے خوش جہاں ہے اب

طاقت کہ جس سے تاب جفا تھی سو ہو چکی
تھوڑی سی کوفت میں بھی بہت سائب ہے اب
نے چاہ وہ اُسے ہے نہ مجھ کو ہے وہ دماغ
جانا مرا ادھر کو بشرط طلب ہے اب

نا سازی طبیعت ایسی کہ اُس کے اوپر
ہے ہر کسو سے مجھ کو ناچار ساز و اجب

اس عمر برق جلوہ کی فرصت بہت ہے کم
جو کام پیش آوے تجھ اس میں ہو شتاب

غفلت سے یہ ضرور تجھے ورنہ ہے بھی کچھ
 یاں وہ سماں ہے جیسے کہ دیکھے ہے کوئی خواب
 یہ بستیاں آج کے کہیں بستیاں بھی ہیں
 دل ہو گیا خراب جہاں پھر رہا خراب
 کاش اُس کے روبرو نہ کریں مجھے کو حشر میں
 کتنے مرے سوال ہیں جن کا نہیں جواب
 مسکن جہاں تھا دل زدہ مسکن کا ہم توواں
 کل دیر میر میر پکارے نہیں ہے اب

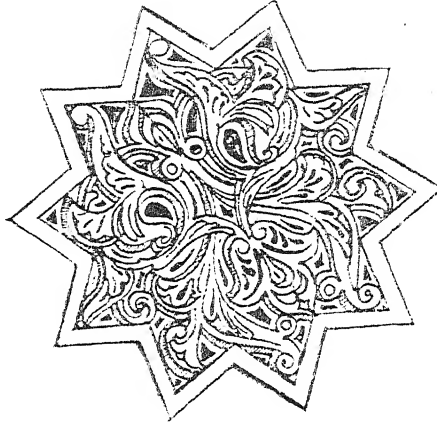
دنیا میں حسن و خوبی میر اک عجیب شے ہے
 رندان و یارسایاں جس پر رکھیں نظر سب

یارب کدھر گئے وہ جو آدمی روشن تھا
 آج تو دکھائی دے ہیں شہر و دہ و نگر سب
 حرف و سخن سے مطلق یاں گفتگو نہیں ہے
 پیادے سوار ہم کو آئے نظر نگر سب
 عالم کے لوگوں کا ہے تصویر کا سا عالم
 ظاہر کھلی ہیں آنکھیں لیکن ہیں بے خبر سب
 میر اس خرابے میں کیا آباد ہووے کوئی
 دیوار و در گزے ہیں ویراں پڑے ہیں گھر سب

شب ہائے تار و تیرہ زمانے میں دن ہوئے
 شب ہجر کی بھی ہووے سحر تو ہے کیا عجب
 جائے ہے چشم شوخ کسو کی ہزار جا
 آوے ادھر بھی اُس کی نظر تو ہے کیا عجب

آیا ہے شیب سر پہ گیا ہے شباب اب
 کبنا جو کچھ ہو تم کو سو کر لہ شتاب اب

بگڑا بنا ہوں عشق سے سو بار عاقبت
 پایا قرار یہ کہ رہوں میں خراب اب
 خوں ریزی عاشقوں کی ہے ظالم اگر ثواب
 تو تو ہوا ہے تجھ کو بہت سا ثواب اب



ردیف ت

تو جنس کے خواہاں ملیے بازار چہاں میں
لیکن نہ ملا کوئی خریدار محبت
اس راز کو رکھتے جی ہی میں تا جی بچے تیرا
دنہار جو کرتا ہو تو اظہار محبت

اب تو چپ لگ گئی ہے حسرت سے
پھر کہلے گی زبان جب کی بات
نکتہ دان رفتہ کی نہ کہو
بات وہ ہے جو ہوئے اب کی بات
اُس کا روئے سخن نہیں اودھڑ
ہے نظر میں ہساری سب کی بات
ظلم ہے قہر ہے قہامت ہے
غصے میں اُس کے زیر لب کی بات
کہتے ہیں آگے تھا بتوں میں رحم
ہے خدا جانئے یہ کب کی بات
گو کہ آتش زبان تھے آگے میر
اب کی کہئے گئی وہ تب کی بات

دیر کچھ کھچتی تو کہتے بھی ملاقات کی بات
ملنا جو اپنا ہوا اُس سے سو وہ ہو بات کی بات
گفتگو شاہد و مے سے ہے نہ غیبت نہ گاہ
خانقہ کی سی نہیں بات خرابات کی بات

ہوتی ہے گرچہ کہنے سے یارو پرائی بات
پر ہم سے تو تہمی نہ کہہو منہ پر آئی بات

کہتے تھے اُس سے ملتے تو کیا کیا نہ کہئے لیک
وہ آگیا تو سامنے اُس کے نہ آئی بات
اب تو ہوئے ہمیں ہم بھی تیرے دھب سے آشنا
وہاں تو نے کچھ کہا کہ ادھر ہم نے پائی بات
بلبل کے بولنے میں سب انداز ہیں مرے
پوشیدہ کب رہی ہے کسو کی آرائی بات
عالم سیاہ خانہ ہے کس کا کہ روز و شب
یہ شور ہے کہ دیتی نہیں کچھ سنائی بات
اک دن کہا تھا یہ کہ خموشی میں ہے وقار
سو مجھ سے ہی سخن نہیں میں جو بتائی بات
اب مجھ ضعیف و زار کو مت کچھ کہا کرو
جاتی نہیں ہے مجھ سے کسو کی اُٹھائی بات

ملا مت گر نہ مجھ کو کر ملا مت
جلے کو اور تو اتنا جلا مت
تری نا آشنائی کے ہیں بندے
نہ وہ اب ربط نے صاحب سلامت
بہت رونے نے رسوا کر دکھایا
نہ چاہت کی چھپی ہم سے علامت

شعر کے پردے میں میں نے غم سنایا ہے بہت
مرثیے نے دل کے میرے بھی دلایا ہے بہت
وادی و کہسار میں روتا ہوں تارہیں مار مار
دلبران شہر نے مجھ کو ستایا ہے بہت
وا نہیں ہوتا کسی سے دل گرفتہ عشق کا
ظاہر اغمگیں اُسے دھنا خوش آیا ہے بہت

مت ان نمازیوں کو خانہ ساز دیں جانو
 کہ ایک ایفٹ کی خاطریہ دھاتے ہیں گے مسیت
 غم زمانہ سے فارغ ہیں مایہ باختگان
 قمار خانہ آفاق میں ہے ہمار بھی جیت

مجھے بے نوا کی یاد رہے میر یہ صدا
 اس میکدے میں رہیو بہت ہوشیار دوست

پھول گل شمس و قمر سارے ہی تھے
 پر ہمیں ان میں تسہیں بھائے بہت
 میر سے پوچھا جو میں عاشق ہو تم
 ہو کے کچھ چپکے سے شرمائے بہت

کوشش اپنی تھی عبث پر کی بہت
 کیا کریں ہم چاہتا تھا جی بہت

ہمیں عشق میں میر چپ لگ گئی ہے
 نہ شکر و شکایت نہ حرف و حکایت

چشم دھنے لگی پر آب بہت
 شاید آوے گا خون ناب بہت
 دیر و کعبے میں اُس کے خواہش مند
 ہوتے پھرتے ہیں ہم خراب بہت
 دل کے دل ہی میں رہ گئے ارمان
 کم رہا موسم شباب بہت
 مارنا عاشقوں کا گر ہے ثواب
 تو ہوا ہے تسہیں ثواب بہت

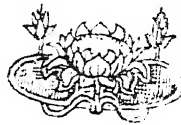
تھی بکھر کی سی لہر کہ آئی چلی گئی
 پہنچی ہے اس سرے تئیں طبع رواں کی بات
 اب تو وفا و مہر کا مذکور ہی نہیں
 تم کس سسین کی کہتے ہو یہ کہاں کی بات

منہ پہ رکھتا ہے وہ نقاب بہت
 ہم سے کرتا ہے وہ حجاب بہت
 چشمک گل کا لطف بھی نہ اُٹھا
 کم رہا موسم شباب بہت
 دھونڈتے اُس کو کوچے کوچے پھرے
 دل نے ہم کو کیا خراب بہت
 چلنا اپنا قریب ہے شاید
 جاں کرے ہے اب اضطراب بہت
 اس غصیلے سے کیا کسو کی نبھے
 مہربانی ہے کم نقاب بہت

کب آوے گا کیا جانے وہ سر و قامت
 ہمارے تو سر پر ابھی ہے قیامت
 نماز سفر ہے اشارت اسی سے
 کہ تھوڑا بہت یاں ہے وقت اقامت
 رہا رابطہ غارت دل تلک بس
 نہیں اب تو بندے سے صاحب سلامت
 گریباں کو گل چاک کرنے لگیں گے
 کھلے رکھے گلستاں میں بند قیامت
 اُٹھا کر نہ یک زخم شمشیر اس کا
 غزال حرم نے اُٹھائی ملامت
 بگڑتی ہے صورت علاقے سے دل کے
 کسو ہے وفا سے دل اپلا لگا مت

کوئی فصل گل میں بھی توبہ کرے ہے
 رہے گی ہمیں دیر اس کی تداومت
 کہیں دل کی لاگیں لگیں چہتیاں ہمیں
 کہ چہرے کی زردی بڑی ہے علامت
 گئے سو گئے پیوستہ تھی جوانی
 وہ عشق میں میرا آئندہ جا ست

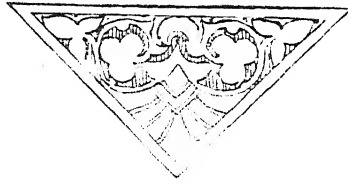
یہ دایا میرے کہ شکامہ رہا کرتا تھا رات
 شور و شر سے میرے اک فتنہ رہا کرتا تھا رات
 کام کیا تھا چیب و دامن سے مجھے پیش از جنوں
 سینہ چاکی اپنی میں بیٹھا کیا کرتا تھا رات
 جن دنوں کیلچا تھا سر اس بادشاہ حسن نے
 ہر گلی میں اک فقیر اس کی دعا کرتا تھا رات
 اب جہاں کچھ بات چہتری سوچ لایا پیش ازیں
 میں کہا کرتا غم دل وہ سنا کرتا تھا رات
 شجر میں کیا کیا سمیں دیکھے ہیں ان آنکھوں سے میں
 زرد رخ پر لالہ گوں آنسو بہا کرتا تھا رات
 بعد میرے اس غزل پر بھی بہت رووینگے لوگ
 میں بھی ہر ہر بیت پر اس کے بکا کرتا تھا رات
 دیکھہ خالی جا کہیں گے برسوں اہل درزگار
 میرا اکثر دل کا قصہ یاں کہا کرتا تھا رات



دریفت ج

ساقی تک ایک موسم کل کی طرف بھی دیکھو
تیرا پڑے ہے رنگ چمن میں ہوا سے آج

شیشہ مزاحی ساغر میناسب کل تک بھی حاضر تھ
کوئے بادہ فروشاں میں یہ میری حرمت کیا ہے آج



دیف چ

عشق میں اے طبیب ہاں تک سوچ
پائے جان درمیاں ہے یاں، تک سوچ
سرسری مت جہاں سے جا غافل
پاؤں تیرا پڑے جہاں، تک سوچ
پھیل اتنا پڑا ہے کیوں تو یاں
یار اگلے گئے کہاں، تک سوچ
غولت اپنا ہلا نہ سمجھے بن
یعنی جب کھولے تو زباں، تک سوچ
گل و رنگ و بہار پردے ہیں
ہر عیاں میں ہے وہ نہاں، تک سوچ
فائدہ سرچھکے کا شیب میں میر
پیری سے آگے اے جوان تک سوچ

ایک سوویں جو زباں و دل تو کچھ نکلے بھی کام
یوں اثر اے میں کیا ہو گریہ وزاری کے بیچ

اے بوئے گل سمجھ کے مہکے پون کے بیچ
زخمی پڑے ہیں مرغ ہزاروں چمن کے بیچ

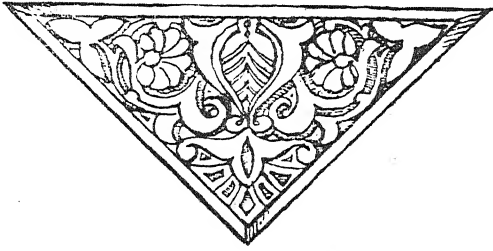
مذتظار برسوں دھے افسوس آخر مر گئے
دیدنی تھے لوگ اس ظالم کے پیساروں کے بیچ

دل یہی ہے جس کو دل کہتے ہیں اس عالم کے بیچ
کاش یہ آفت نہ عورتی قالب آدم کے بیچ
رونق آبادی ملک سخن ہے اُس تلک
ہوں ہزاروں دم الہی میں کے اک دم کے بیچ

ردیف ح

جوں سبزہ چل چمن میں لب جو پہ سیر کر
 عمر عزیز جاتی ہے آب رواں کی طرح
 جوں سقف بے عمد ہو، نہیں اس کا اعتماد
 کس خانماں خراب نے کی آسماں کی طرح

یوسف کی اس نظیر سے دل کو نہ جمع رکھ
 ایسی متاع جاتی ہے بازار ہر طرح



درف

مرے سنگ مزار پر فرہاد رکھ کے تیشہ کہے ہے یا استاد
 فکر تعمیر میں نہ رہا متمم زندگانی کی کچھ بھی ہے بنیاد
 خاک بھی سر پہ ڈالنے کو نہیں کس خرابے میں ہم ہوئے آباد
 سنتے ہو تک سنو کہ پھر مجھ بعد نہ سنو گے یہ نالہ و فریاد
 ہر طرف ہیں اسیر ہم آواز باغ ہے گھر ترا تو اے صیاد
 ہم کو مرنا یہ ہے کہ کبھوں کہیں اپنی قید حیات سے آزاد

ہمیں اسیر تو ہونا ہے اپنا چھا یاد
 کشش نہ دام کی دیکھ نہ کوشش صیاد
 نہ درد مندی سے یہ راز تم چلے ورنہ
 قدم قدم پہ تھی یاں جائے نالہ و فریاد
 ثبات قصرو درد و بام و خشت و گل کتنا
 عمارت دل درویش کی رکھو بنیاد
 چمن میں یار ہمیں لے گئے تھے ورنہ ہوئے
 ہمارے ساتھ یہی غم یہی دل فاشاد

تن کو جس جاگہ سے چھیڑوں ہوں وہاں ہے درد درد
 ہاتھ لگتے دل کے ہو جانا ہوں کچھ میں درد درد
 اب تو وہ حسرت سے آہ و نالہ بھی کرنا گیا
 کوئی دم ہونٹوں تک آجانا ہے گاہے سرد سرد

کم ناز سے ہے کس کے بندے کی بے نیازی
 تالاب میں خاک کے یاں پنہا خدا ہے شاید

ہے عشق کا فسانہ میرا یاں زباں زد
 ہر شہر میں ہوئی ہے یہ داستان زباں زد

حسرت سے حسن گل کے چپکا ہوا ہوں ورنہ
 طیران باغ میں ہوں خوش زباں زباں زد
 مذکور عاشقی کا ہر چار سو ہے باہم
 یعنی نہیں کہانی میری کہاں زباں زد
 فرہاد قیس و وامق ہر یگ سے پوچھ لو تم
 شہروں میں عشق کے ہوں میں ناتواں زباں زد
 کیا جانے میر کس کے غم سے ہے چپ و گرنہ
 حرف و سخن میں کی ہے یہ جوان زباں زد
 کچھ ہوش نہ تھا منبر و محراب کا ہم کو
 صد شکر کہ مسجد میں ہوئے مستی میں وارد

عمر عزیز ساری منت ہی کرتے گزری
 بے جرم آہ رہئے یوں عذر خواہ ناچند
 یاں ناز و سرکشی سے کیا دیکھنا نہیں ہے
 کج اس چمن میں تھیرے گل کی کلاہ ناچند

نہیں خوں بستگی سے چشم تر بند
 جراحت نے کئے ہیں چشم پر بند
 گیا ہے وہ سو دل کھلتا نہیں ہے
 آ پڑا ہے ایک مدت سے یہ گھر بند
 گئے دن تکتی کے باندھنے کے
 اب آنکھیں دھتی ہیں دو دو پہر بند

ہمیں منظور ہر صورت میں ہے دید
 کھلی ہو چشم جوں آئینہ یا بند



دریغ و

قدم دشت محبت میں نہ رکھتے میر
کہ سر جاتا ہے گام اولیں پر

میر صاحب زمانہ نازک ہے
دونوں ہاتھوں سے تھا مکے دستار
سہل سی زندگی پہ کام کے تئیں
اپنے اوپر نہ کیجئے دشوار
چار دن کا ہے مجھلے یہ سب
سب سے رکھئے سلوک ہی ناچار
وہاں جہاں خاک کے برابر ہے
قدر ہفت آسمان ظلم شعار
یہی درخواست پاس دل کی ہے
نہیں روزہ نماز کچھہ درکار
در مسجد پہ حلقہ زن ہو تم
کہ رہو بیٹھہ خانہ خسار
جی میں آوے سو کیجیو پیارے
ایک ہو جو نہ دریئے آزار
حاصل دو جہاں ہے یک حرف
ہو مری جان آگے تم مختار

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے
پچھتاؤ گئے سہو ہو یہ بستی آجاز کر
یارب رہ طلب میں کوئی لب تلک پھرے
تسکین دے کہ بیٹھہ رہوں پانوں گاڑ کر
غالب کہ دیوے قوت دل اس ضعیف کو
تکے کو جو دکھاوے ہے پل میں بہار کر

جی میں تھا اُس سے ملئے تو کیا کیا نہ کہئے میر
پر جب ملے نہ رہ گئے نہ چار دیکھ کر

پائے ثبات بھی ہے نام آوری کو لازم
مشہور ہے نگین جو بیتھا ہے گھر میں گھر کر
دیکھو نہ چشم کم سے معمورۂ جہاں کو
بنتا ہے ایک گھر یاں سو صورتیں بگڑ کر

شیخی کا اب کمال ہے کچھہ اور
حال ہے اور قال ہے کچھہ اور
سہل مت بوجھہ یہ طلسم جہاں
ہر جگہ یاں خیال ہے کچھہ اور
نہ ملیں گو کہ ہجر میں مرجائیں
عاشقوں کا وصال ہے کچھہ اور
کوز پستی پہ شیخ کی مت جاؤ
اس پہ بھی احتمال ہے کچھہ اور

ہم ضعیفوں کو پائمال نہ کر
دولت حسن پر نہ ہو مغرور
عرش پر بیتھتا ہے کہتے ہیں
گر اُتے ہے غبار خاطر مور
شکوۂ آبلہ ابھی سے میر
ہے پیارے ہنوز دلی دور

مشت خاک اپنی جو پامال ہے یاں اُس پہ نہ جا
سر کو کھینچے گا فلک تک یہ غبار آخر کار
چشم وا دیکھ کے اس باغ میں کیجیو نرگس
آنکھوں سے جاتی رہے گی یہ بہار آخر کار

اول کار محبت تو بہت سہل ہے میسر
جی سے جاتا ہے ولے صبر و قرار آخر کار

مورگ اک مانند گی کا رہا ہے یعنی آگے چھپیں گے دم لے کر

وے لوگ تم نے ایک ہی شوخی میں کہو دئے
پیدا کئے تھے چرخ نے جو خاک چھان کر

حاصل بجز کدورت اس خاکداں سے کیا ہے
خوش وہ کہ اُٹھ گئے ہیں دامن جھٹک جھٹک کر
یہ مشیت خاک یعنی انسان ہی ہے روکش
ورنہ اُٹھائی کن نے اس آسماں کی تکر
منزل کی میسر اُس کی کب راہ تجھ سے نکلے
یاں خضر سے ہزاروں مر مر گئے بھٹک کر

حال کہہ چپ رہا تو میں۔ بولا
کس کا قصہ تھا ہاں کہے جا میسر

رفتار میں یہ شوخی رحم اے جواں زمیں پر
لاتا ہے تازہ آفت تو ہر زمانہ زمیں پر
آنکھیں لگی رہیں گی برسوں وہیں سیہوں کی
ہوگا قدم کا تیرے جس جانناں زمیں پر
آتا نہ تھا فرو سر جن کا کل آسماں سے
ہیں تھکروں میں اُن کے آج استخوان زمیں پر
جو کوئی یاں سے گزرا کیا آپ سے نہ گزرا
پانی رہا کب اتنا ہو کر رواں زمیں پر
پھر بھی اُٹھائی سر پر تم نے زمیں سب آکر
کیا کیا ہوا تھا تم سے کچھ آگے یاں زمیں پر

کچھ بھی مناسبت ہے یاں عجڑواں تکبر
وے آسمان پر ہیں میں نا توں زمیں پر
پست و بلند یاں کا ہے اور ہی طرف سے
اپنی نظر نہیں ہے کچھ آسمان زمیں پر
قصر جنان تو ہم نے دیکھا نہیں جو کہئے
شاید نہ ہووے دل سا کوئی مکان زمیں پر
یاں خاک سے اُنہوں کے لوگوں نے گھر بنائے
آثار ہیں جنہوں کے اب تک عیاں زمیں پر

اے صباگر شہر کے لوگوں میں سو تیرا گزار
کھپو ہم صحرانوردوں کا تماشائی حال زار
خاک دہلی سے جدا ہم کو کیا یکبار گئی
آسمان کو تھی کدورت سو نکالا یوں غبار
منصب بلبل غزل خوانی تھا سو وہ ہے اسیر
شاعری زاغ و زغن کا ہو نہ ہووے اب شعار
طائر خوش زمزمہ کنج قفس میں ہے خموش
چھپے چڑیاں کریں ہیں صحن گلشن میں ہزار
برگ گل سے بھی کیا نہ ایک نے تک ہم کو یاد
نامہ و پیغام و پرسش بے مراتب درگزار
بے خلش کیوں کر نہ ہو گرم سخن گلزار میں
میں قفس میں ہوں کہ میرا تھا دلوں میں اُن کے خار
بلبل خوش لہجہ کی جائے پہ گو غوغائیاں
طرح غوغا کی چمن میں ڈالیں پر کیا اعتبار
طائران خوش لب و لہجہ نہیں رہتے چھپے
شور سے اُن کے بھرے ہیں قریہ و شہر و دیار
شہر کے کیا ایک دو کو چوں میں تھی شہرت رہی
شہروں شہروں ملکوں ملکوں ہے اُنہوں کا اشتہار

کیا کہوں سوئے چمن ہوتا جو میں سرگرم گشت
 پیول گل جب کیلئے لگتے جوش زن ہوتی بہار
 شور سن سن کر غزل خوانی کا میری ہم صنیر
 غنچہ ہو آتے جو ہوتا آب و رنگ شا خسار
 خوش نوائی کا جنہیں دعویٰ تھا رہ جاتے خموش
 جن کو میں کرتا مخاطب اُن کو ہوتا افتخار
 بعضوں کو رشک قبول خاطر و لطف سخن
 بعضوں کا سینہ فگار اور بعضوں کا دل داغدار
 ایک کے ہونقوں کے اوپر آفریں استاد تھا
 ایک کہتے تھے رسوخ دل ہے اپنا استوار
 ربط کا دعویٰ تھا جن کو کہتے تھے مخلص ہیں ہم
 جانتے ہیں ذات سامی ہی کو ہم سب خاکسار
 نقل کرتے کیا یہ صحبت مذمقہ جب ہوتی بزم
 بیتہ کر کہتے تھے منہ پر میرے بعضے بعضے یار
 بدد گی ہے خدمت عالی میں ہم کو دیر سے
 کر دکھی ہے جان اپنی ہم نے حضرت پر نثار
 سونہ خط اُن کا نہ کوئی پرچہ پہنچا مجھے تلک
 واہ واہ رابطہ رحمت ہے یہ اخلاص و پیار
 رفتہ رفتہ ہو گئیں آنکھیں بھی اب میری سفید
 بس کہ نامے کا کیا یاروں کے میں نے انتظار
 لکھتے گرد و حرف لطف آمیز بعد از چند روز
 تو بھی ہوتا اس دل بیتاب و طاقت کو قرار
 سو تو اک نبرشتہ کاغذ بھی نہ آیا میرے پاس
 ان ہم آوازوں سے جن کا میں کیا ربط آشکار
 خط کتابت سے یہ کہتے تھے نہ ببولیں گے تجھے
 آویں گے گھر بار کی تیرے خبر کو بار بار
 جب کیا میں یاد سے تب کس کا گھر کا ہے کا پاس
 آفریں صد آفریں اے مردمان روزگار

اب بیبا بان در بیبا بان ہے مرا شور و فغان
گو چمن میں خوش کی تم نے بھری جاے نالہ وار
میں نے مثل مشہور یہ عمر سفر کو تہا ہے
طالع برگشتہ بھی کرتے ہیں اب امداد کار
اک پرافشانی میں بھی ہے یہ وطن گلزار سا
سامعوں کی چہا تیاں نالوں سے ہوویںگی فکار
منہ پر آویں گے سخن آلودہ خون جگر
کیوں کہ یاران زماں سے چاک ہے دل جوں انار
لب سے لے کر تا سخن ہیں خونچکاں شکوے بھرے
لیک ہے اظہار ہر ناکس سے اپنا ننگ و عار
چپ بھلی گو تلخ کامی کھینچنی اس میں پیوی
بیمت بھٹی طبع نازک پر ہے اپنی ناگوار
آج سے کچھ بے حسا بی جو رکن مردم نہیں
ان سے اہل دل سدا کھینچے ہیں رنج بے شمار
بس قلم رکھتے ہاتھ سے جانے بھی دے یہ حرف میر
کاہ کے چاہے نہیں کہسار ہوتے بے وقار
کام کے جو لوگ صاحب فن ہیں سو محسود ہیں
بے تہی کرتے رہیں گے حاسدان نابکار

کچھ ہورہے گا عشق و ہوس میں بھی امتیاز
آیا ہے اب مزاج نرا امتحان پر
پہنچانے اس کی داد کو مجلس میں کوئی رات
ماڑا بہت پتنگ نے سر شمع دان پر
تھوڑے میں دور کھینچے ہے کیا آدم آپ کو
اس مشمت خاک کا ہے دماغ آسان پر

فرصت ہے اس چمن کی گل بو کے میں جو دیو چھلے
چشمک کی ایک گل نے میری طرف کو ہنس کر

اس قافلے میں کوئی دل آشنا نہیں ہے
 تکرے گلے کے اپنے ناحق نہ اے جس کر
 صیاد اکرا اجازت گنگشت کی نہیں تک
 دیوار پانچ کو تو ہمارے در قفس کر

صورت پرست ہوتے نہیں معنی آشنا
 ہے عشق سے بتوں کے مرا مدعا کچھ اور
 مرنے پہ جاندیتے ہیں وارفتگان عشق
 ہے میسر راہ درسم دیار وفا کچھ اور

چمکے ہے جب سے برق سحر گلستان کے اور
 جی اگ رہا ہے خار و خس آشیاں کے اور
 یاں تاب سعی کس گر جذب عشق کا
 لاوے اسی کو کھینچ کسو ناتوان کے اور
 یاد دل وہ دیدنی تھی جگہ یا کہ تجھ بغیر
 اب دیکھنا نہیں ہے کوئی اس مکان کے اور

مذہب سے میرے کیا تجھ میرا دیار اور
 میں اور یار اور میرا کار و بار اور
 بندے کو ان فقیروں میں گئے نہ شہر کے
 صاحب نے میرے مجھ کو یا اعتبار اور

سعی و طلب بہت کئی مطلب کے تئیں نہ پہنچے
 نا چار اب جہاں سے بیٹھے ہیں ہاتھ اٹھ کر
 ارمان ہے جہنم سکومے اب کریں محبت
 عم تو ہوے بھیمان دل کے تئیں لگا کر

سدر گوش گل میں کہا میں نے جا کر
 کھلے بند مرغ چمن سے ملا کر
 لگا کہنے فرصت ہے یاں اک تبسم
 سو وہ بھی گریباں میں منہ چھپا کر

تفا سب پر اعضا کی اتنا تبختر
 بگاڑا تجھے خوب صورت بنا کر
 قیامت رہا اضطراب اُن کے غم میں
 جگو پھر گیا رات ہونٹوں پہ آکر
 مبارک تمہیں میر ہو عشق کرنا
 بہت ہم تو پچھتاے کو دل لگا کر

اے مرغ چمن صبح ہوئی زمزمہ سر کر
 دم کھینچ تہ دل سے کوئی تکرے چکر کر
 ہے بے خبری مجھ کو ترے دیکھ سے ساقی
 ہر لحظہ مری جان مجھے میری خبر کر
 پوئے نگہ اُس شوخ کی ہوتا ہے یہ احوال
 رہ جاوے ہے جیسے کہ کوئی بجلی سے ڈر کر
 معشوق کا کیا وصل ورے ایسا دھرا ہے
 ناشمع پتنگا بھی جو پھنکے ہے تو مر کر
 جس جائے سراپا میں نظر جاتی ہے اُس کی
 آتا ہے مرے جی میں یہیں عمر بسر کر
 کسب اوو کیا ہوتا عوض ریختہ کے کاش
 پچھتاے بہت میر ہم اس کام کو کر کر

مت اس چمن میں غنچہ دوش ہوا ہاں نہ
 ماند گل شگفتہ جبین یاں معاش کر

دل رکھہ قوی فلک کی زبردستی پر نہ جا
گر کشتی لگ گئی ہے تو تو بھی تلاش کر
ہے کیا تو جیسے غلچہ بندھی مٹھی جا چلا
مت گل کے رنگ منہ کو کھلا راز فاش کر

عشق محبت یاری میں اک لطف رکھے ہے کرنا ضبط
چھاتی پر جو ہو کوہ الم کا تو بھی نالہ و آہ نہ کر
مانگ پناہ خدا سے بندے دل لگنا اک آفت ہے
عشق نہ کر نہ ہمار نہ کر والدہ نہ کر بالہ نہ کر

کیا جانئے کہ دل پر گزرے ہے میر کیا کیا
کرنا ہے بات کوئی آنکھیں پر آب کر کر
سن سن کے درد دل کو بولا کہ جاتے ہیں ہم
تو اپنی یہ کہانی بیٹھا ہوا کہا کر
اگے زمیں کی تہ میں ہم سے بہت تھ تو بھی
سر پر زمیں اُٹھائی ہم بے تہوں نے آکر

بزم میں منہ اُدھر کو ہیں کیوں کر
اور نیچے نظر کریں کیوں کر
یوں بھی مشکل ہے ووں بھی مشکل ہے
سر چھکائے گزر کریں کیوں کر
مہ فلک پر ہے وہ زمیں پر آہ
ان کو زید و زبد کریں کیوں کر
دل نہیں درد مند اپنا میر
آہ و نالہ اثر کریں کیوں کر

گرچہ انسان ہیں زمیں سے ولے
انہیں دماغ ان کے آسمانوں پر

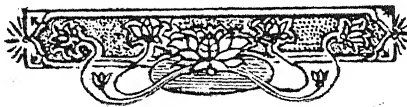
عرش و دل دونوں کا ہے پایہ ہے بلند
سیرِ شبّتی ہے اُن مکانوں پر
قصے دنیا میں میں بہت سننے
نہ دکھو گوش اُن افسانوں پر

سوئے نہ لگ چل اس سے اے باد تو نے ظالم
بہتیروں کو سلایا اس کو جگا جگا کر
یوسف عزیز دلہا جا مصر میں ہوا تھا
ذلت جو ہو وطن میں تو کوئی دن سفر کر
کیا حال زار عاشق کرئے یہاں نہ پوچھو
کرنا ہے بات کوئی دل کی تو چشم تر کر

اقرار میں کہاں ہے انکار کی سی خرابی
ہوتا ہے شوق غالب اُس کی نہیں نہیں پر
کنچ قفس میں جوں توں کاٹینگے ہم اسیراں
سیر چمن کے شایاں اپنے رہے نہیں پر
غمے میں عالم اس کا کیا کیا نظر پڑا ہے
تلواریں کھینچتیاں تھیں اُس کی جبین کی چیم پر

کہتا ہے کون تجھکو یاں یہ نہ کر تو وہ کر
پر ہو سکے تو پیارے دل میں بھی تک جگہ کر

مرتے ہیں میو سب ، یہ نہ اس بیکسی کے ساتھ
ماتم میں تیرے کوئی نہ رویا پکار کر



دیفنس

حرماں تو دیکھتے پھول بکھیرے نہی کل صبا
اک برگ کل گرا نہ، جہاں تھا مرا قفس
اے گریہ اُس کے دل میں اثر خوب ہی کیا
دوتا ہوں جب میں سامنے اُس کے تو دے ہے ہنس

درد مندوں سے تمہیں دور پہرا کرتے ہو کچھ
پوچھنے ورنہ سبھی آتے ہیں بیسار کے پاس
داغ ہوتا نظر آتا ہے دلوں کا آخر
یہ جواک خال پڑا ہے ترے رخسار کے پاس
کیا رکھا کرتے ہو آئینے سے خلوت ہر دم
تک کبھو بیٹھو کسو طالب دیدار کے پاس

—:0:—

دیفنس

شب اس دل گرفتہ کو وا کر بزورِ مے
بیٹھے تھے شہرہ خانے میں ہم کتنے ہرزہ کوش
آئی صدا کہ یاد کرو دورِ رفتہ کو
عبرت بھی ہے ضرور تک اے جمع تیز ہوش
جمشید جن نے وضع کیا جام کیا ہوا
وے صحبتیں کہاں گئیں کیدھر وے نا و نوش
جز لالہ اس کے جام سے پاتے نہیں نشان
ہے کو کنار اس کی جگہ اب سب بدوش
جھومے ہیں بید جاے جوانان مے گسار
بالاے خم ہے خشت سر پیر مے فروش

میر اس غزل کو خوب کہا تھا ضمیر نے
پر اے زبان دراز بہت ہو چکی خموش

گل کو ہوتا صبا قرار اے کاش^x
دھتی اک آدہ دن بہار اے کاش
اس میں راہ سخن نکلتی تھی
شعر ہوتا ترا شعار اے کاش
شش جہت اب تو تلگ ہے ہم پر
اس سے ہوتے نہ ہم دو چار اے کاش
بے اجل میر اب پڑا مرنا
عشق کرتے نہ اختیار اے کاش

کیا کہئے کیا رکھیں ہیں ہم تجھ سے یار خواہش^x
یک جان و صد تنہا یک دل ہزار خواہش
لے ہاتھوں میں قفس تک صیاد چل چمن میں
مدت سے ہے ہمیں بھی سیر بہار خواہش
نے کچھ گڈہ ہے دل کا نے جرم چشم اس میں
رکھتی ہے ہم کو اتنا بے اختیار خواہش
حالانکہ عمر ساری مایوس گزری تسپر
کیا کیا رکھیں ہیں اُس کے امیدوار خواہش

بتوں کے غم میں نالاں جب نہ تب ہوں
نہ راضی خلق مجھ سے نے خدا خوش
رہا پھولوں میں کرتا زمزمہ میں
مری اس باغ میں گزری سدا خوش

کیا پتہ لگے کو شمع روئے میر
اس کی شب کو بھی ہے سحر درپیش

—:O:—

ردیف ظا

جو وہ ہے تو ہے زندگانی سے حظ
مزا عمر کا ہے جوانی سے حظ
نہیں وہ تو سب کچھ یہ بے لطف ہے
نہ کھانے سے لذت نہ پانی سے حظ
کہا درد دل رات کیا میر نے
اُٹھاتے بہت اس کہانی سے حظ

—:O:—

ردیف ف

جو دیکھو مرے شعر تر کی طرف
تو مائل نہو پھر گھر کی طرف
محبت نے شاید کہ دی دل کو آگ
دھواں سا ہے کچھ اس نگر کی طرف
نظر کیا کروں اس کے گھر کی طرف
نگاہیں ہیں میری نظر کی طرف
چھپاتے ہیں مذہ ایسا کامل سے سب
نہیں کوئی کرت ہلر کی طرف
بڑی دھوم سے ابر آئے گئے
نہ کوئی ہوا چشم تر کی طرف
اندھا دھند روتے ہیں آنکھوں سے خوں
نہیں دیکھتے ہم جگر کی طرف

رہا ہے خبر گرچہ ہجراں میں میسر
رہے گوش اس کی خبر کی طرف

نظر کیوں گئی دو و مو کی طرف
کھنچا جائے دل کسو کی طرف
نہ دیکھو کبھو موتیوں کی لہری
جو دیکھو مری گفتگو کی طرف
اُسے دھونڈتے میسر کھوئے گئے
کوئی دیکھے اس جستجو کی طرف

اے تجھے بغیر لالہ و باغ و بہار حیف
گل سے چمن بھریں ہوں نہ ہو تو ہزار حیف

ردیف ق

میر جی زرد ہوتے جاتے ہو
کیا کہیں تم نے بھی کیا ہے عشق

ردیف ک

کچھہ ہو اے مرغ قفس لطف نہ جائے اس سے
نوحہ یا نالہ ہراک بات کا انداز ہے ایک
ناتوانی ہے، نہیں بال فشانے کا دماغ
ورنہ تا باغ قفس سے مری پرواز ہے ایک
گوش کو ہوش کے تک کھول کے سن شور جہاں
سب کی آواز کے پردے میں سخن ساز ہے ایک

چاہے جس شکل سے تمثال صفت اُس میں درا
عالم آئینے کے مانند در باز ہے ایک

کچھ اپنی آنکھ میں آیا نہ یاں کا
خزف سے لیکے دیکھا در تر تک
جسے شب آگ سا دیکھا سلگتے
اُسے پھر خاک ہی پایا سحر تک

حال میرا شہر میں کہتے رہیں گے لوگ دیر
اُس فسانے کے نئیں ہونے تو دو مشہور تک
پشت پامارے ہے شاہی پر گداے کوے عشق
دیکھو تم یاں کا خدا کے واسطے دستور تک

رہے ہے غش و درد و دودو پھر تک
سر زخم پہنچا ہے شاید جگر تک
ہوے ہیں حواس اور ہوش و خرد کم
خبر کچھ تو آئی ہے اس بے خبر تک
بہار آئی پر ایک پتی بھی گل کی
نہ آئی امیران بے بال و پر تک

بہت میر برہم جہاں میں رہیں گے
اگر رہ گئے آج کی شب سحر تک

وہ تو نہیں کہ اودھم دھتا تھا اشیاء تک
آشوب نالہ اب تو پہنچا ہے آساں تک
ہجران کے سختیوں سے پتھر دل جگر ہیں
صبر اس کی عاشقی میں کوئی کرے کہاں تک

دل دھڑکے ہے جو بجلی چمکے ہے سوے گلشن
 پہنچے مبادا میری خاشاک آشیاں تک
 دیواروں سے بھی مارا پتہ۔ ور سے پہوڑ ڈالا
 پہنچا نہ سر ہمارا حیف اُس کے آستان تک
 یہ تنگی و نزاکت اُس رنگ سے کہاں ہے
 گلبرگ و غنچے پہنچیں کب اُن لب و دھان تک

:۰:

ردیف گ

بن جو کچھ بن سکے جوانی میں
 رات تو تھوڑی ہے بہت ہے سانگ
 میر بندوں سے کام کب نکلا
 مانگنا ہے جو کچھ خدا سے مانگ

وہ مرگ سے کیوں ڈراتے ہیں لوگ
 بہت اُس طرف کو تو جاتے ہیں لوگ

:۰:

ردیف ل

سبزہ نورستہ دھگڑا کا ہوں
 سر اٹھایا کہ ہو گیا پامال
 کیوں نہ دیکھوں چمن کو حسرت سے
 آشیاں تھا مرا بھی یاں پر سال
 ہجر کی شب کو یاں تئیں توپا
 کہ ہوا صبح ہوتے میرا وصال

عبارت خوب لکھی شاعری انشا طرازی کی
 لیے مطلب ہی گم دیکھیں تو کب ہو مدعا حاصل

پیدا مت میر سر اپنا گراں گوشوں کی مجلس میں
سنے کوئی تو کچھ کہئے بھی ایسے کہنے کا حاصل

آئی بہار نکلے چمن میں ہزار گل
دل جو کھلا فسر دے تو جوں بے بہار گل

گل کی جفا بھی دیکھی، دیکھی وفائے بلبل
یک مشمت پر پڑے تھے گلشن میں جاے بلبل
کر سیر جذب الفت۔ گل چیں نے کل چمن میں
توڑا تھا شاخ گل کو، نکلی صدائے بلبل
کہتے ہیں خار ہو کر ہر شب دل چمن میں
اتنے لب و دھن پر یہ نالہائے بلبل
یک رنگیوں کی راہیں طے کر کے مر گیا ہے
گل میں دگیں نہیں ہیں، ہیں نقش ہائے بلبل
آی بہار و گلشن گل سے بہا ہے لیکن
ہر گوشہ چمن میں خالی ہے جاے بلبل
پیغام بے غرض بھی سنتے نہیں ہیں خوباں
پہنچی نہ گوش گل تک آخر دعائے بلبل
یہ دل خراش نالہ ہر شب کے میر تیرے
کر دیں گے بے فسک ہی شور نوائے بلبل

طریق عشق میں ہے رہنا دل
پیہر دل ہے، قبلہ دل، خدا دل
رکا اتنا، خفا اتنا ہوا تھا
کہ آخر خون ہو ہو کر بہا دل
جسے مارا اُسے پھر کر نہ دیکھا
ہمارا طرفہ ظالم سے لگا دل

گئے وحشت سے باغ و راغ میں تھے
 کہیں تھہرا نہ، دنیا سے اُٹھا دل
 اسیری میں تو کچھہ واشد کبھو تھا
 رہا غمگین ہوا جب سے رہا دل
 ہمہ تن میں الم تھا سو نہ جانا
 گرہ یہ درد ہے پہلو میں یا دل
 خموشی مجھہ کو حیرت سے ہے ورنہ
 بھرے ہیں لب سے لے کر شکوے تا دل

—————:O:—————

دیف م

ہے پیچدر ازیس راہ وصال و ہجران
 ان دو ہی منزلوں میں برسوں سفر کرو تم
 یہ ظلم ہے تو ہم بھی اس زندگی سے گزرے
 سو گند ہے تمہیں اب جو در گزر کرو تم
 دوے سخن کہاں تک غیروں کی اور آخر
 ہم بھی تو آدمی ہیں تک مذہب ادھر کرو تم
 ہو عاشقوں میں اُس کے تو آؤ میر صاحب
 گردن کو اپنی مو سے باریک تر کرو تم
 کیا لطف ہے وگر نہ جس دم وہ تیغ کھینچے
 سہلہ سپر کریں ہم قطع نظر کرو تم

اگر راہ میں اُس کی دکھا ہے گام
 گئے گزرے خضر علیہ السلام
 دھن یار کا دیکھہ چپ لگ گئی
 سخن یاں ہوا ختم حاصل کلام
 قیامت ہی یاں چشم و دل سے دہی
 چلے بس تو واں جا کے کوڑے مقام

نہ دیکھے جہاں کوئی آنکھوں کی اور
نہ لیوے کوئی جس جگہ دل کا نام

گرچہ آوارہ جوں صبا ہیں ہم
لیک لگ چلنے میں بلا ہیں ہم
کام کیا آتے ہیں گے معلومات
یہ تو سمجھے ہی نہ کہ کیا ہیں ہم
اے بقاء اس قدر جفا ہم پر
عاقبت بندۂ خدا ہیں ہم
کوئی خواہاں نہیں ہمارا میر
گوٹیا جنس ناروا ہیں ہم

یہی جانا کہ کچھ نہ جانا ہائے
سو بھی اک عمر میں ہوا معلوم

کس طور کوئی تجھ سے مقصود کرے حاصل
نہ رحم نرے جی میں نے دل میں ترس ظالم

میں خاک میں ملانہ کروں کس طرح سفر
مجھ سے غبار رکھتے ہیں اہل وطن تمام
کچھ ہند ہی میں میر نہیں لوگ جیب چاک
ہے میرے ریختوں کا دوانا دکن تمام

جی کے تئیں چھپاتے نہیں یوں تو غم سے ہم
پر تنگ آگئے ہیں تہارے ستم سے ہم
اپنے خیال ہی میں گذرتی ہے اپنی عمر
پر کچھ نہ پوچھو سمجھے نہیں جاتے ہم سے ہم

ہر ہر سخن پہ اب تو کرتے ہو گفتگو تم
 ان بد مزاجیوں کو چھوڑو گے بھی کبھو تم
 چاہیں تو تم کو چاہیں دیکھیں تو تم کو دیکھیں
 خواہش دلوں کی تم ہو آنکھوں کی آرزو تم

کم پائی اس قدر ہے منزل ہے دور اتنی
 طے کس طرح کرو گے یارو یہ مرحلے تم

میں کہا دیکھو ادھر تک تم تو میں بھی جان دوں
 ہنس کے بولے یہ تری باتیں ہیں پھر دیکھینگے ہم

نہ ہوئے تھے ابھی جوان افسوس
 صبر مغفور و طاقت مرحوم
 جب غبار اپنے دل کا نکلے ہے
 دیر رہتی ہے آندھی کی سی دھوم
 صاحب اپنا ہے بندہ پرورد میر
 ہم جہاں سے نہ جائیں گے مرحوم

—:0:—

ردیف ن

بیکلی بے خودی کچھ آج نہیں
 ایک مدت سے وہ مزاج نہیں
 درد اگر یہ ہے تو مجھے بس ہے
 اب دوا کی کچھ احتیاج نہیں
 ہم نے اپنی سی کی بہت لیکن
 مرض عشق کا علاج نہیں
 شہر خوبی کو خوب دیکھا میر
 جنس دل کا کہیں رواج نہیں

اس طرح دل گیا کہ اب تک ہم
 بیٹھے روتے ہیں ہاتھ ملتے ہیں
 اُمّی آنی ہیں آج یوں آنکھیں
 جیسے دریا کہیں اُبلتے ہیں
 دم آخر ہے بیٹھ جا مت جا
 صبر کر تک کہ ہم بھی چلتے ہیں
 تیرے بیخود جو ہیں سو کیا چیتیں
 ایسے دَوے کہیں اُچھلتے ہیں

دیں عمر خضر موسم پیری میں تو نہ لے
 مرنہ ہی اس سے خوب ہے عہد شباب میں

متصل روتے ہی دھئے تو بجھے آتش دل
 ایک دو آنسو تو اور آگ لگا جاتے ہیں
 وقت خوش اُن کا جو ہم بزم ہیں تیرے ہم تو
 در و دیوار کو احوال سنا جاتے ہیں
 ایک بیسار جدائی ہوں میں آپ ہی تسپہ
 پوچھنے والے جدا جان کہہ جاتے ہیں
 میر صاحب بھی ترے کوچے میں شب آتے ہیں
 جیسے در یوزہ گری کرنے گدا جاتے ہیں

اس کے کوچے میں نہ کر شور قیامت کا ذکر
 شیخ یاں ایسے تو ہنگامے ہوا کرتے ہیں
 بے بسی سے تو تری بزم میں ہم بہرے بنے
 نیک و بد کوئی کہے بیٹھے سنا کرتے ہیں
 فرصت خواب نہیں ذکر بتاں میں ہم کو
 رات دن دام کہانی سی کہا کرتے ہیں

یہ زمانہ نہیں ایسا کہ کوئی زیست کرے
 چاہتے ہیں جو برا اپنا بھلا کرتے ہیں
 محض ناکارہ ہی مت جان ہمیں تو کہ کہیں
 ایسے نا کام بھی بے کار پھرا کرتے ہیں
 تجھ بن اس جان مصیبت زدہ غم دیدہ پہ ہم
 کچھ نہیں کرتے تو افسوس کیا کرتے ہیں
 کیا کہیں میر جی ہم تم سے معاش اپنی غرض
 غم کو کھایا کریں ہیں لوہو پیا کرتے ہیں

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ
 مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہساریاں

زباں رکھ غلچہ ساں اپنے دھن میں
 بندھی مٹھی چلا جا اس چمن میں
 کہاں عاجز سخن قادر سخن ہوں
 ہمیں ہے شبہ یاروں کے سخن میں

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
 تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں
 کس کا ہے تماشا ایسا گودے بھرے ہیں سارے
 دیکھو نہ جو لوگوں کے دیوان نکلتے ہیں

دھوے کو یار آگے معیوب کر چکے ہیں
 اس ریختے کو ورنہ ہم خوب کر چکے ہیں
 مرنے سے تم ہمارے خاطر نچلت رکھو
 اس کام کا بھی ہم کچھ اسلوب کر چکے ہیں
 حسن کلام کھینچے کیوں کر نہ دامن دل
 اس کام کو ہم آخر معیوب کر چکے ہیں

اپنی ہی صیر کرنے دم جلوہ گر ہرے تھے
اس رمز کو ولیکن معدود جاننے ہیں

کچھ کچھ کہو نگارو: یہ کہتا تھا دل میں میں
آشفته طبع میر کو پایا اُتر کہیں
سوکل ملا مجھے وہ بیابان کی سمت کو
جانا تھا اضطراب زدہ سا ادھر کہیں
لگ چل کے میں ب رنگ صبا یہ اُسے کہا
کے خانساں خراب تر ابھی ہے گھر کہیں
آشفته جا بجا جو پھرے ہے تو دشت میں
جاگہ نہیں ہے شہر میں تجھ کو مگر کہیں
آسودگی سی زندگی جلس کو کرتا ہے کون سوخت
جانے ہے نفع کوئی بھی جی کا ضرر کہیں
موتی سے تیرے اشک ہیں غلطان کسو طرف
یا قوت کے سے تکرے ہیں لخت چگر کہیں
تا کے یہ دشت گردی و کب تک یہ خستگی
اس زندگی سے کچھ تجھے حاصل ہے مر کہیں
کہنے لگا وہ ہو کے ہر آشفته یک یک
مسکن کرے ہے دھر میں مجھ سا بشر کہیں
آوارہ گان کوننگ ہے سننا نصیحتیں
مت کہو ایسی بات تو بار دگر کہیں
تجھیں جا کو بھول گیا ہوں پہ یہ ہے یاد
کہتا تھا ایک روز یہ اہل نظر کہیں
بیٹھے اگرچہ نقش ترا تو بھی دل اُٹھا
کرتا ہے جائے باش کوئی رہگذر کہیں
کتنے ہی آئے لے گئے سر پر خیال سیر
ایسے گئے کہ کچھ نہیں اُن کا اثر کہیں

نہ تنگ کر ایسے اے فکر روزگار کہ میں
دل اس سے دم کے لئے مستعار لایا ہوں

چٹائیوں دیکھ، لیاں بے وفائیاں دیکھیں
بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں

ٹک سن کہ سو برس کی ناموس خامشی کہو
دو چار دن کی باتیں اب منہ پر آئیاں ہیں

میں کون ہوں اے ہم نفساں سوختہ جاں ہوں
اک آگ سرے دل میں ہے جو شعلہ نشاں ہوں
لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر
میں ورنہ وہی خلوتی راز نہاں ہوں
جلوہ ہے مہیہ سے لب دریاے سخن پر
صد رنگ مری موج ہے میں طبع رواں ہوں
پانچہ ہے مرا پنچہ خورشید میں ہر صبح
میں شانہ صفت سایہ رو زلف بتاں ہوں
دیکھا ہے مجھے جن نے سو دیوانہ ہے میرا
میں باعث آشتی طبع جہاں ہوں
تکلیف نہ کر آہ مجھے جنبش لب کی
میں صد سخن آغشتہ بختوں زیر زباں ہوں
ہوں زرد غم تازہ نہالان چمن سے
اس باغ خزاں دیدہ میں میں برگ خزاں ہوں
دکھتی ہے مجھے خواہش دل بس کہ پریشاں
درپے نہ ہو اس وقت خدا جانے کہاں ہوں
اک وہم نہیں بھی مری ہستی موہوم
اس پر بھی تری خاطر نازک پہ گراں ہوں

تا بیہونگئے نہ خرقۂ طامات کے تئیں
 حسن قبول کیا ہو مناجات کے تئیں
 سید ہو یا چسار ہو اس جا وفا ہے شرط
 کیا عاشقی میں پوچھتے دیں ذات کے تئیں
 آخر کے یہ سلوک ہم اب تیرے دیکھ کر
 کرتے ہیں یاد پہلی ملاقات کے تئیں

ایک دم پر ہے بنا تیری سو آیا کہ نہیں
 وہ کچھ اس زندگی میں کر کہ تجھے یاد کریں
 ریختہ خوب ہی کہتا ہے جو انصاف کرو
 چاہئے اہل سخن میرو کو اُستاد کریں

ملنے لگے ہو دیر دیر دیکھئے کیا ہے کیا نہیں
 تم تو کرو ہو صاحبی بلدے میں کچھ رہا نہیں
 بے گل اور درنگ گل دو نوہیں دل کش اے نسیم
 لیک بقدر یک نگاہ دیکھئے تو وفا نہیں
 شکوہ کروں ہوں بخت کا اتنے غضب نہو بتاں
 مجھ کو خدا نخواستہ تم سے تو کچھ گلا نہیں
 نالے کیا نہ کر سنا، نوحے مرے بہ عذلیب
 بات میں بات عیب ہے میں نے تجھے کہا نہیں
 چشم سفید اشک سرخ آہ دل حزیں ہے یاں
 شیشہ نہیں ہے مے قمیں ابر نہیں ہوا نہیں
 ایک فقط ہے سادگی تسبیہ بلاے جاں ہے تو
 عشوہ کرشمہ کچھ نہیں آن نہیں ادا نہیں
 آب و ہواے ملک عشق تحریک کی ہے میں بہت
 کر کے دواے درد دل کوئی بھی پھر جیا نہیں

تجھہ عشق میں مرنے کو تیار بہت ہیں
یہ جرم ہے تو ایسے گنہگار بہت ہیں
کوئی تو زمزمہ کرے میرا سادل خراش
یوں تو قفس میں اور گرفتار بہت ہیں

خوب رو سب کی جان ہوتے ہیں
آرزوے جہان ہوتے ہیں
کبھو آتے ہیں آپ میں تجھہ بن
دُہر میں ہم میہمان ہوتے ہیں
کیا رہا ہے مشاعرہ میں اب
لوگ کچھہ جمع آن ہوتے ہیں
میر و مرزا رفیع و خواجہ میر
کتنے اک یہ جہان ہوتے ہیں

جنوں میرے کی باتیں دشتِ ارد گلشن میں جب چلیاں
نہ چوبِ گل نے دم مارا نہ چھریاں بید کی ہلیاں
تفاوت کچھہ نہیں شیرین و شکر اور یوسف میں
سبھی معشوق اگر پوچھے کوئی مصری کی بھیں دلیاں
دوا نہ ہو گیا تو میرِ آخر ریختہ کہہ کہہ
نہ کہتا تھا میں اے ظالم کہ یہ باتیں نہیں بہاں

بزم میں جو نرا ظہور نہیں
شمع روشن کے منہ پہ نور نہیں
کتنے باتیں بجا کے لاؤں ایک
یاد رہتی تیرے حضور نہیں
فکر مت کر ہمارے جینے کا
تیرے نزدیک کچھہ یہ دور نہیں

یوں جائیگے جو تجھ سے جان بخش
ایسا چمکنا جس سے ضرور نہیں

نام ہے یار کی تجلی میو
خاص موسیٰ کو کہ طور نہیں

دا مان و جیب و دیدہ و مژگان و آستین
اب کون سا رٹا ہے کہ اُن میں سے تو نہیں

مسجد سے میکدے پر گاش ابروز برے
واں رو سفیدیاں ہیں یاں روسیاہیاں ہیں
غالب تو یہ ہے زاہد رحمت سے دور ہوے
درکار و اُن گنہ ہیں یاں بے گناہیاں ہیں
شاہد لوں میو کس کو اہل محلہ سے میں
محضر پہ خون کے میوے سب کی گواہیاں ہیں

تجھ بھی یار اپنا یوں تو ہم ہر بار کہتے ہیں
ولے کم ہیں بہت وے لوگ جن کو یار کہتے ہیں
سمجھہ کر ذکر کر آسودگی کا مجھہ سے اے ناصح
وہ میں ہی ہوں کہ جس کو عاقبت بیزار کہتے ہیں
عجب ہوتے ہیں شاعر بھی میں اس فرقے کا عاشق ہوں
کہ بے دھڑکے بھری مجلس میں یہ اسرار کہتے ہیں

داد لے چھوڑوں میں صیاد سے اپنی لیکن
ضعف سے میوے تئیں طاقت فریاد نہیں
کیا کہوں میو فراموش کیا اُن نے تجھ
میں تو تفریب بھی کی پر تو اُسے یاد نہیں

یک لحظہ سینہ کو ہی سے فرصت ہمیں نہیں
یعنی کہ دل کے جانے کا ماتم بہت ہے یاں

ہم دھرواں راہ فنا دیر رہ چکے
 وقفہ بسان صبح کوئی دم بہت ہے یاں
 اس بتکدے میں معنی کا کس سے کریں سوال
 آدم نہیں ہے صورت آدم بہت ہے یاں
 عالم میں لوگ ملنے کے گوں اب نہیں رہے
 ہر چند ایسا ویسا تو عالم بہت ہے یاں
 ویسا چین سے سادہ نکلتا نہیں کوئی
 رنگینی ایک اور خم وچم بہت ہے یاں
 شاید کہ کام صبح تک اپنا کھنچ نہ میر
 احوال آج شام سے درہم بہت ہے یاں

کھول کر دیوان میرا دیکھ قدرت مدعی
 گرچہ ہوں میں نوجواں پرشاعروں کا پیر ہوں

کہے ہے کوہ کن کر فکر میری خستہ حالی میں
 الہی شکر کرتا ہوں تری درگاہ عالی میں
 میں وہ پڑ مردہ سبزہ ہوں کہ ہو کر خاک سے سرزد
 یکا یک آگیا اس آسماں کی پائالی میں

نہ کیوں کہ شیخ توکل کو اختیار کریں
 زمانہ ہووے مساعد تو روزگار کریں
 گیا وہ زمزمہ صبح فصل گل بلبل
 دعا نہ پہنچی چمن تک ہم اب ہزار کریں
 تمام صید سرتیر جمع ہیں لیکن
 نصیب اس کے کہ جس کو ترا شکار کریں

تو اک زباں پہ چپکی نہیں رہتی عندا لب
 رکھتا ہے منہ پہ غنچہ گل سو زباں کے تئیں

ہم تو ہوئے تجھے میرے اس دن ہی ناامید
جس دن سنا کہ ان نے دیا دل بتان کے تئیں

سوے سہتے سہتے جفا کاریاں
کوئی ہم سے سیکھے وفاداریاں
ہماری تو گزری اسی طور عمر
یہی نالہ کرنا یہی زاریاں
فرشتہ جہاں کام کرتا نہ تھا
مروی آہ نے برچھیاں ماریاں

گیا جان سے یک جہاں لیک شوخ
نہ تجھے سے گئیں یہ دل آزاریاں
خط و کاکل و زلف و انداز و ناز
ہوئیں دام دہ صد گرفتاریاں

کیا درد و غم نے مجھے ناامید
کہ مجنوں کو یہ بھی تھیں بیساریاں
تیری آشنائی سے ہی حد ہوئی
بہت کی تھیں دنیا میں ہم یاریاں
نہ بھائی ہماری تو قدرت نہیں
کھنچیں میرے تجھے سے ہی یہ خواریاں

دن نہیں رات نہیں صبح نہیں شام نہیں
وقت ملنے کا مگر داخل ایام نہیں
مثل علقا مجھے تم دور سے سن لو ورنہ
نگ ہستی ہوں مری جائے بجز نام نہیں
بے قراری جو کوئی دیکھے ہے سو کہتا ہے
کچھ تو ہے میرے کہ اک دم تجھے آرام نہیں

آرزوئیں ہزار رکھتے ہیں
تو بھی ہم دل کو مار رکھتے ہیں

برق کم حوصلہ ہے ہم بھی تو
دلک بے قرار رکھتے ہیں

شیر ہے مورد عنایت ہائے
ہم بھی تو تم سے پیار رکھتے ہیں

نہ نگہ نے پیام نے وعدہ
نام کو ہم بھی یاد رکھتے ہیں

ہم سے خوش زمزمہ کہاں یوں تو
لب و لہجہ ہزار رکھتے ہیں

چو تگے دل کے ہیں بتاں مشہور
بس یہی اعتبار رکھتے ہیں

پھر بھی کرتے ہیں میو صاحب عشق
ہیں جوان، اختیار رکھتے ہیں

یہ جو چشم پر آب ہیں دونوں
یک خانہ خراب دونوں

رونا آنکھوں کا روئیے کب تک
پھوٹنے ہی کے باب ہیں دونوں

ہے تکلف نقاب، وے و خسار
کیا چھپیں آفتاب ہیں دونوں

تن کے معمورے میں یہی دل و چشم
گھر تھے دو، سو خراب ہیں دونوں

کچھ نہ پوچھو کہ آتش غم سے
جگر و دل کہاں ہیں دونوں

ایک سب آگ ایک سب پانی
دیدہ و دل عذاب ہیں دونوں

آگے دریا تھے دیدہ تر میو
اب جو دیکھو سراپ ہیں دونوں

مدعی سمجھ کو کہتے صاف برا کہتے ہیں
 چپکے تم سنتے ہو بیٹھے اسے کیا کہتے ہیں
 دیکھے خوبیاں کے بجائے دل نہیں رہتا ہو گز
 لوگ جو کچھ نہیں کہتے ہیں بجائے کہتے ہیں
 حسن تو ہے ہی کرو لطف زباں بھی پیدا
 میر کو دیکھو کہ سب لوگ بہلا کہتے ہیں

دیر و حرم سے تو تو تک گرم ناز نکلا
 جنگاہ ہو رہا ہے اب شینخ و بھمن میں
 ہمیں گھاؤ دل پر اپنے تیغ زباں سے سب کی
 تب درد ہے ہمارے اے میر ہر سخن میں

طائران خوش معاش اس باغ کے تھے ہم کبھو
 اب ترستے ہیں قفس میں اک پر افشانی کے تئیں
 دل جو پانی ہو تو آئینہ ہے روے یار کا
 خانہ آبادی سمجھ اس خانہ ویرانی کے تئیں
 فہم میں میرے نہ آیا پردہ در ہے طفل اشک
 روؤں کیا اے ہم نشیں میں اپنی نادانی کے تئیں

کیا کہوں اول بخود تو دیر میں آتا ہوں میں
 پھر جو یاد آتا ہے وہ چپکا سا رہ جاتا ہوں میں

کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے
 کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں

بعدے جانے سے نہیں کچھ سمجھ کو اتنا شوق ہے
 چال وہ بتلا کہ میں دل میں کسو کے جا کروں

اب کہ ہمت صرف کر جو اس سے جی اچتے مرا
پھر وہی اے میر مت کریو اگر کروں

عشق میں جی کو صبر و تاب کہاں
اس سے آنکھیں لگیں تو خواب کہاں
ہستی اپنی ہے بیچ میں پردہ
ہم نہ ہوویں تو پھر حجاب کہاں
گریہ شب سے سرخ ہیں آنکھیں
مجھے بلا نوش کو شراب کہاں
عشق کا گھر ہے میر سے آباد
ایسے پھر خانماں خراب کہاں

میں تو خوبیاں کو جانتا ہی ہوں
پر مجھے بھی یہ خوب جانے ہیں
اب تو افسردگی ہی ہے ہر آن
وے نہ ہم ہیں نہ وے زمانے ہیں
فیس و فرہاد کے وہ عشق کے شور
اب مرے عہد میں فساتے ہیں
مشک و سنبل کہاں وہ زلف کہاں
شاعروں کے یہ شاخسانے ہیں
عشق کرتے ہیں اُس پری دوسے
میر صاحب بھی کیا دوانے ہیں

اب کے جنون میں فاصلہ شاید ہی کچھہ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

گل پھول کوئی کب تک جھڑ جھڑ کے گرتے دیکھے
اس باغ میں بہت اب جوں غنچہ میں دکا ہوں

کب شب ہوئی زمانے میں جو پھر ہوا نہ روز
 کیا اے فراق یار تجھی کو سکر نہیں
 ہر چند ہم کو مستوں سے صحبت رہی ہے لیک
 دامن ہمارا ابر کے مانند تر نہیں

میں جی سنبھالتا ہوں وہ ہنس کے ٹالتا ہے
 یاں مشکلیں ہیں ایسی واں یہ مسالے ہیں

باغ گو سبز ہوا اب سر گلزار کہاں
 دل کہاں وقت کہاں عمر کہاں یار کہاں
 دم زدن مصلحت وقت نہیں اے ہمد
 جی میں کیا کیا ہے مرے پر لب اظہار کہاں

یہ جوش غم ہوتے بھی ہیں یوں ابر تر روتے بھی ہیں
 چشم جہاں آشوب سے دریا بہایا ایک میں
 ہیں طالب صورت سبھی مجھے پر ستم کیوں استدر
 کیا مجرم عشق بتاں یاں ہوں خدایا ایک میں
 بھلی سے یوں چمکے بہت پر بات کہتے ہو چمکے
 جوں ابر ساری خلق پر ہوں اب تو چھایا ایک میں

صبح چمن کا جلوہ ہندی بتوں میں دیکھا
 صندل بھری جبین ہیں ہونٹوں کی لالیاں ہیں
 اجماع بوالہوس کو رکھ رکھ لیا ہے آگے
 مت جان ایسی بھڑیں جان دیئے والیاں ہیں
 ان گلر خون کی قامت لہکے ہے یوں ہوا میں
 جس رنگ سے لچکتی پھولوں کی ڈالیاں ہیں

رفتگاں میں جہاں کے ہم بھی ہیں
 ساتھ اس کارواں کے ہم بھی ہیں
 جس چمن زار کا ہے تو گل تر
 بلبل اس گلستان کے ہم بھی ہیں
 وجہ بیگانگی نہیں معلوم
 تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں
 مرگئے مرگئے نہیں تو نہیں
 خاک سے منہ کو دھانکے ہم بھی ہیں

زبانیں بدلتے ہیں ہر آن خو باں
 یہ سب کچھ ہیں بگڑے زمانے کی باتیں
 ہمیں دیر و کعبے سے کیا گفتگو ہے
 چلی جاتی ہیں یہ سیانے کی باتیں

کچھ تمہیں ملنے سے بیزار ہو میرے ورنہ
 دوستی ننگ نہیں عیب نہیں عار نہیں
 ناز و انداز وادا عشوہ و اغماز و حیا
 آب و گل میں ترے سب کچھ ہے یہی پیار نہیں
 صورت آئینے میں ٹک دیکھ تو کیا صورت ہے
 بد زبانی تجھے اس منہ پہ سزاوار نہیں
 دل کے الجھاؤ کو کیا تجھے سے کہوں اے ناصح
 تو کسو زلف کے پھندے میں گرفتار نہیں

جہاں سے دیکھئے اک شعر شورا نگیز نکلتے ہے
 قیامت کا سا ہنگامہ ہے جا میرے دیواں میں

اب پست و بلند ایک ہے جوں نقش قدم یاں
 پامال ہوا خوب تو ہموار ہوا میں

کیا چیتنے کا فائدہ جو شیب میں چیتا
سونے کا سماں آیا تو بیدار ہوا میں

جائے ہے جی نجات کے غم میں
ایسی جنت گئی جہنم میں
بے خودی پر نہ میر کی جاؤ
تم نے دیکھا ہے اور عالم میں

مجھے کو دماغ و صف گل و یا سمن نہیں
میں جوں نسیم باد فروش چمن نہیں
کل جا کے ہم نے میر کے ہاں یہ سنا جواب
مدت ہوئی کہ یہاں وہ غریب الوطن نہیں

تم کہو میر کو چا ہو سو، کہ چاہیں ہیں تمہیں
اور ہم لوگ تو سب اُن کا ادب کرتے ہیں

نئی گردش ہے اس کی ہر زماں میں
خلل سا ہے دماغ آسمان میں
کہا میں درد دل یا آگ اگلی
پھپھولے پڑ گئے میری زباں میں
تری شورش بھی بے کل ہے مگر میر
ملا دی پیس کر بجلی فغاں میں

محبوب کا وصال نہ مجھے کو ہوا نصیب
دل سے ہزار خواہشیں سر کو پتک گئیں
بھردی تھی چشم ساقی میں یارب کہاں کی مے
مجلس کی مجلسیں نظر اک کرتے جھک گئیں

غزل میر کی کب پڑھائی نہیں
 کہ حالت مجھے غش کی آئی نہیں
 زباں سے ہماری ہے صیاد خوش
 ہمیں اب اُمید دھائی نہیں
 نسیم آئی میرے قفس میں عبث
 گلستان سے دو پھول لائی نہیں

اس شہ حسن کا اقبال کہ ظالم کے نہیں
 ہر طرف سیکڑوں درویش دعا دیتے ہیں
 طرفہ صنّاع ہیں اے میر یہ موزوں طبعان
 بات جاتی ہے بگڑ بھی تو بنا دیتے ہیں

پنج روزہ عمر کرے عاشقی یا زاہدی
 کام کچھ چلتا نہیں اُس تھوڑی سی مہلت سے یاں
 کیا سر جنگ و جدل ہو بے دماغ عشق کو
 صلح کی ہے میر نے ہفتاد و دو ملت سے یاں

پہرا میں صورت احوال ہر اک کو دکھاتا یاں
 صورت قحط ہے آنکھیں نہیں کوئی ملاتا یاں
 خرابہ دھلی کا دہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا
 وہیں میں کاش مہرجانا سراسیمہ نہ آتا یاں

دن ہیں بڑے کبھو کے راتیں بڑی کبھو کی
 رہتے نہیں ہیں یکساں لیل و نہار دونوں

پیری ہی اب تو کہئے سو کیا کہئے ہم نشیں
 کس رنج : غم میں گزریں ہیں اپنی جوانیاں

ظلم و ستم سے خون کیا پھر دبا رہا
 ہر باد کیا گڈیوں میں مری جانفشانیاں
 میں آپ چہیز چہیز کے کھاتا ہوں گالیاں
 خوش آگڈیوں میں اُس کی مجھے بد زبانیاں
 سنتا نہیں ہے شعر بھی وہ خوف ناشنو
 دل ہی میں خوں ہوا کیوں مری نکتہ دانیان
 باتیں کذب رقیب کی ساری ہوئیں قبول
 مجھے کو جو اُن سے عشق تھا میری نمانیاں
 مجلس میں تو خفیف ہوئے اُس کے واسطے
 پھر اور ہم سے اُتھتی نہیں سر گرانیاں
 عالم کے ساتھ جائیں چلے کس طرح نہ ہم
 عالم تو کاروان ہے ہم کاروانیاں

درا میں کہاں شور ایسا دھوا نہا
 کسو کا مگر دل رکھا تھا جرس میں
 ہمیں عشق میں بے کسی بے بسی ہے
 نہ دشمن بھی ہو دوستی کے تو بس میں
 تن زار لاغر میں ظاہر رہیں ہیں
 بھرا ہے مگر عشق اک ایک نس میں
 محبت وفا مہر کرتے تھے باہم
 اُٹھا دی ہیں وے تم نے اب ساری رسمیں

غم ہجراں میں گھبرا کر اُٹھا میں
 طرف گلزار کے آیا چلا میں
 شگفتہ خاطری اُس بن کہاں تھی
 چمن میں غنچہ پیشانی رہا میں
 کسو سے دل نہیں ملتا ہے یارب
 ہوا تھا کس گھڑی اُن سے جدا میں

تعارف ہمصفیروں سے نہیں کچھ
 ہوا ہوں ایک مدت میں رہا میں
 گیا صبر آخر آزار دلی پر
 بہت کرتا رہا دارو دوا میں
 ہوا تھا میر مشکل عشق میں کام
 کیا پتھر جگر تب کی دوا میں

فریاد سے کیا لوگ ہیں دن ہی کو عجب میں
 رہتی ہے خلش نالوں سے میرے دل شب میں

اس کو دل سا مکان دیتے ہیں
 اہل اس گھر پہ جان دیتے ہیں
 کیوں کہ خوش خواں نہ ہوئیں اہل چمن
 ہم انہوں کو زبان دیتے ہیں
 جان کیا گوہر گرامی ہے
 بدلے اس کے جہان دیتے ہیں

کوئی سبب ایسا ہو یا رب جس سے عزت رہ جائے
 عالم میں اسباب کے ہیں پر پاس اپنے اسباب نہیں
 رنگ شکستہ، دل ہے شکستہ، سر ہے شکستہ، مستی میں
 حال کسو کا اپنا سا اس میخانے میں خراب نہیں

مے کشی صبح و شام کرتا ہوں
 فاقہ مستی مدام کرتا ہوں
 کوئی نا کام یوں رہے کب تک
 میں بھی اب ایک کام کرتا ہوں
 یا تو لیتا ہوں داد دل یا اب
 کام اپنا تمام کرتا ہوں

اُس سے گہرا کے جو کچھ کہنے پتہ آ جاتا ہوں
 دل کی پھر دل میں لئے چپکا چلا جاتا ہوں
 سعی دشمن کو نہیں دخل مری ایذا میں
 رنج سے عشق کے میں آپ کہہ جاتا ہوں
 گوچہ کہو یا سا گیا ہوں یہ تہ حرف سخوں
 اس فویہ بندہ عشاق کی پا جاتا ہوں
 خشم کہوں بے مزگی کاہے کو بے لطفی کیا
 بد برا تھا بھی نہ ہو مجھ سے بھلا جاتا ہوں
 استقامت سے ہوں چون کوہ قوی دل لیکن
 ضعف سے عشق کے ڈھتا ہوں گرا جاتا ہوں
 مجلس یار میں تو بار نہیں پاتا میں
 در و دیوار کو احوال سنا جاتا ہوں
 اک بیاباں ہے مری بے کسی و بے تابی
 جیسے آواز جرس میں سے جدا جاتا ہوں
 تنگ آ رہے گا کہاں تک نہ مرا قلب سلیم
 بگڑی صحت کے تمہیں روز بنا جاتا ہوں

اب دیکھیں آہ کیا ہو ہم دے جدا ہوئے ہیں
 بے یار و بے دیار و بے آشنا ہوئے ہیں
 غیرت سے نام اس کا آیا نہیں زباں پر
 آگے خدا کے جب ہم محو دعا ہوئے ہیں
 اہل چمن سے کیوں کر اپنی ہو روشناسی
 برسوں اسیر رہ کر اب ہم رہا ہوئے ہیں

بے کار مجھ کو مت کہہ میں کار آمدہ ہوں
 بیگانہ وضع تو ہوں پر آشنا زدہ ہوں
 میں منہ نہیں لگایا بخت عجب کو گامے
 تب تھا جوان صالح اب پیر میکدہ ہوں

اسرار دل کے دہتے ہیں پھر جوان میں
مطلق نہیں ہے ہند ہمداری زبان میں
دنگینی زمانہ سے خاطر نہ جمع رکھے
سورنگ بدلے جاتے ہیں یاں ایک آن میں
شید بہار آئی ہے دیوانے ہیں جوان
زنجیر کی سی آئی ہے چھنکار کان میں

سوے پر اور بھی کچھ بڑھ گئی رسوائی عاشق
کہ اس کی نعش کو اب شہر میں تشہیر کرتے ہیں
درو دیوار افتادہ کو بیی کاش اک نظر دیکھیں
عسارت ساز مردم گھر جواب تعمیر کرتے ہیں

عشق کرنا نہیں آسان بہت مشکل ہے
چھاتی پتھر کی ہے ان کی جو وفا کرتے ہیں

نا آشنا کے آپ جیسے ہم آشنا ہیں
اس طور اس طرح کے ایسے کم آشنا ہیں
باہم جو یاریاں ہیں اور آشنا ئیاں ہیں
سب ہیں نظر میں اپنی ہم عالم آشنا ہیں

کیا جنوں ہے تم کو جو تم طالب ویرانہ ہو
جس کو فردوس بریں کہتے ہیں واں آدم کہاں

گو کہ بہت خانے جا رہا ہوں میں
بخدا بخدا رہا ہوں میں
سب گئے دل دماغ و تاب و توان
میں رہا ہوں سو کیا رہا ہوں میں

برق تو میں نہ تھا کہ جل بجھتا
اب تر ہوں کہ چھا رہا ہوں میں

کچھہ اور شے ہے خوب جو دیکھو رخ نگار
ہر چند گل بھی تازہ کھلا اتنا بد نہیں

اس بے کسی سے کون جہاں میں موا کہ میں
جز داغ سینہ آج چراغ لحد نہیں

بے سوز دل کنہوں نے کیا ریختہ تو کیا
گفتار خام پیش عزیزاں سجد نہیں
سویار مست کعبے میں پکڑے گئے ہیں ہم
دسوائی کے طریق کے کچھہ نا بلد نہیں

لطف سخن بھی پیری میں رہتا نہیں ہے میر
اب شعر ہم پڑھے ہیں تورہ شد و مد نہیں

جو جو ظلم کئے ہیں تم نے سوسو ہم نے اٹھائے ہیں
داغ جگر پہ جلے ہیں چھانی پہ جراحت کھائے ہیں
تیغ دریغ نہیں ہے اس کے بسمل کہ میں کسو سے بھی
ہیں تو شکار لاغر ہم پر ایک اُمید پہ آئے ہیں

خمسے لگی میخانے کی دیوار بھی اپنے گھر کی ہے
لطف پیور مغان عجب کیا ہم آخر ہمسائے ہیں
شوق ہے غم میں بے صبری ہے آہ کسو کو کیا کہئے
اچھے اپنے دل کو ہم نے آپ ہی روگ لکائے ہیں

مکھو سخن ہم فکر سخن میں رفتہ ہی بیٹھے رہتے ہیں
آپ کو جب کھویا ہم نے تب سے گوہر پائے ہیں
تب تھے سپاہی اب ہیں جوئی آہ جوانی یوں کاٹی
ایسی تووڑی رات میں ہم نے کیا کیا سوانگ بنائے ہیں

کون وہ ایسا ظالم تھا استاد فن عیاری کا
انفے سن میں جن نے تجھہ کو ایسے فریب سکھائے ہیں

میر مقدس آدمی ہیں تھے سب سے بکف مہتھانے میں
صبح جو ہم بھی جانکے تو دیکھ کے کیا شرمائے ہیں

کہے کون صیدِ رمیدہ سے کہ ادھر بھی بھر کے نظر کرے
کہ نقابِ اُلٹے سوار ہے ترے پیچھے کوئی غبار میں
تری شام خط کے قریب کے جو صفا میں دیکھی ہیں خوبیاں
نہ سمیں یہ گل میں نظر پڑے نہ یہ رنگ صبح بہار میں
کوئی شعلہ ہے کہ شرارہ ہے کہ ہوا ہے یہ کہ ستارہ ہے
یہی دل جولے کے گریں گے ہم تو لگے گی آگ مزار میں
جھکی کچھ کہ جی میں چبھی سبھی ہائی تک کہ دل میں کھیں سبھی
یہ جو لاگ پلکوں میں اسکی ہے نہ چھری میں ہے نہ کتار میں

—:O:—

دنیف و

ہوے تھے جیسے مرجاتے پر اب تو سخت حسرت ہے
کیا دشوار نادانی سے ہم نے کارِ آساں کو
تجھے گر چشمِ عبرت ہے تو آندھی اور بگولے سے
تسا شا کر غبارِ افشانی خاکِ عزیزاں کو
غم و اندوہ بیتابی الم بے طاقتی حرمان
کہوں اے ہم نشینِ نا چنڈ غمہائے فراوان کو
کوئی کانٹا سدرہ کا ہمداری خاک پر بس ہے
گل گلزار کیا درکار ہے گورِ غریباں کو
کیا سیر اس خرابی کا بہت اب چلکے سو رہئے
کسو دیوار کے سائے میں منہ پر ایکے داماں کو

کہتے ہو اتحاد ہے ہم کو
ہاں کہو اعتماد ہے ہم کو

شوق ہی شوق ہے نہیں معلوم
اس سے کیادل نہا ہے ہم کو

اے کس دھب سے روے کم کم
شوق حد سے زیاد ہے ہم کو

شیخ و پیر مغاں کی خدمت میں
دل سے اک اعتقاد ہے ہم کو

نامرادانہ زیست کرتا تھا
میر کا طور یاں ہے ہم کو

خدا کرے کہ نصیب اپنے ہونہ آزادی

کدھر گئے ہو جے جو بے بال پر رہائی ہو

اُس آفتاب سے تو فیض سب کو پہنچے ہے

یقین ہے کہ کچھ اپنی ہی نارسائی ہو

ہزار مرتبہ بہتر ہے باد شاہی سے

اگر نصیب ترے کوچے کی گدائی ہو

مغاں سے راہ تو ہو جائے رفتہ رفتہ شیخ

ترا بھی قصد اگر ترک پارسائی ہو

تا چند کو چہ گردی جیسے صبا زمیں پر

اے صبحگاہی آشوب آسمان ہو

گرد و ق سیر ہے تو آوارہ اس چمن میں

ماقذد عند لب لبم اکبرہ آشیاں ہو

ہم دور ماندگاں کی منزل رساں مگر اب

یاہو صدا جرس کی یاد گرد کارواں ہو

یہ جان تو کہ ہے اک آوارہ دست بردل

خاک چمن کے اوپر درگ خزاں جہاں ہو

ہمسائے اُس چمن کے کتنے شکستہ پرہیں

انہ لئے کہ شاید اک باد کلفشاں ہو

دن گزر تھے مجھے فکر ہی میں تاکیا ہو
رات جاتی ہے اسی غم میں کہ فردا کیا ہو
ایک رونا ہی نہیں آہ غم و نالہ و درد
ہجر میں زندگی کرنے کے تئیں کیا کیا ہو

جاتے نہیں اُٹھائے یہ شور ہر سحر کے
یا اب چمن میں بلبل ہم ہی رہیں گے یا تو
عالم ہے شوق کشتہ خلقت ہے تیری وقتہ
جانوں کہ آرزو تو آنکھوں کا مدعا تو
گفت و شنود اکثر میرے ترے رہے
ظالم معاف رکھیو میرا کہا سنا تو
کہہ سانچہ کے موئے کو اے میرے روئیں کب تک
جیسے چراغ مفلس اک دم میں جل بجھا تو

خوبی یہی نہیں ہے کہ انداز و ناز ہو
معشوق کا ہے حسن اگر دل نواز ہو
ہے فرق میں ہی خیر نہ کر آرزوے وصل
مل بیٹھئے جو اُس سے تو شکوہ دراز ہو
جوں توں کہ اس کے چاؤ کا پودہ کیا ہے میں
اے چشم گریہ ناک نہ افشائے راز ہو
ہم سے تو غیر عاجز کبھو کچھہ بنا نہ میر
خوش حال وہ فقیر کہ جو بے نیاز ہو

عشق کو نفع نہ بیتابی کرے ہے نہ شکیب
کرے تدبیر جو یہ درد دوا رکھتا ہو
ہائے اس زخمی شمشیر محبت کا جگر
درد کو اپنے جو ناچار چھپا رکھتا ہو

ایسے تو حال کے کہنے سے بھلی خاموشی
 کہئے اُس سے جو کوئی اپنا کہا رکھتا ہو
 گل ہو مہتاب ہو آئینہ ہو خورشید ہو میو
 اپنا محبوب وہی ہے جو ادا رکھتا ہو

شیخ جی آؤ مصلیٰ گرو جام کرو
 جنس تقویٰ کے تئیں صرف مے جام کرو
 فرش مستان کرو سجاد گے تہ کے تئیں
 مے کی تعظیم کرو شیشے کا اکرام کرو
 دامن پاک کو آلودہ رکھو بادے سے
 آپ کو مغبچوں کے قابل و دشنام کرو
 نیک نامی و تفاوت کو دعا جلد کہو
 دین و دل پیش کش سادۂ خود کام کرو
 ننگ و ناموس سے اب گزرو جوانوں کی طرح
 پرفشانی کرو اور ساتی سے ابرام کرو
 اُتھ کہوے ہو جو چھکے گردن میٹھے شراب
 خدمت بادہ گساراں ہی سر انجام کرو
 خنکی اتنی بھی تو لازم نہیں اس موسم میں
 یاس جوش گل و دل گرمی ایام کرو
 سایۂ گل میں لب جو بہ گلابی رکھو
 ہاتھ میں جام کو لو آپ کو بدنام کرو
 آہ تا چند رہو خانقہ و مسجد میں
 ایک تو صبح گلستان میں بھی شام کرو
 رات ساری تو گئی سنتے پریشان گوئی
 میر جی کوئی گھڑی تم بھی تو آرام کرو

ہیں کہاں مجھ سے وفا پیشہ نہ بیداد کرو
 نہ کرو ایسا کہ پھر میرے تئیں یاد کرو

ایسے دم پیشہ کہاں ہوتے ہیں اے غمزدگان
مرگ معجزوں پہ کڑھو ماتم فرہاد کرو
اے اسیران تہ دام نہ تزیو اتنا
تا نہ بدنام کہیں چنگل صیاد کرو

صبح سے اور بھی پاتا ہوں اُسے شام کو تند
کام کرتی جو کچھ میری دعا مت پوچھو
ہوش و صبر و خرد و دیں و حواس و دل و تاب
اُس کے اک آنے میں کیا کیا نہ گیا مت پوچھو
وقت قتل آرزوے دل جو لگے پوچھنے لوگ
میں اشارت کی اُدھر اُن نے کہا مت پوچھو
خواہ مارا اُنہیں نے میر کو یا آپ مروا
جانے دو یارو جو عونا تھا ہوا مت پوچھو

اُس کی طرز نگاہ مت پوچھو
جی ہی جانے ہے آہ مت پوچھو
کہیں پہنچو گئے بے رہی میں بھی
مگر ہاں یوں یہ راہ مت پوچھو
نو گرفتار دام زلف اس کا
ہے یہی روسیاء مت پوچھو

سائے میں ہر پلک کے خواہیدہ ہے قیامت
اُس فتنہ زماں کو کوئی جگا تو دیکھو
بلبل بھی کل گئی پر مر کر چمن سے نکلی
اُس مرغ شوق کش کی تک تم وفا تو دیکھو
دو بے ہے کشتی میری بحر عمیق غم میں
پہکانے سے کھڑے ہو تم آشنا تو دیکھو

اُئے جو ہم تو اُن نے آنکھوں میں ہم کو رکھا
 اہل ہوس سے کوئی اودھر کو جا تو دیکھو

یہی مشہور عالم ہیں دو عالم
 خدا جانے ملاپ اُس سے کہاں ہو
 جہاں سجدے میں ہم نے غش کیا تھا
 وہیں شاید کہ اس کا آستان ہو
 ہوئے ہم پیر سو ساکت ہیں اب میر
 تمہاری بات کیا ہے تم جوان ہو

صحبت آخر ہے ہماری نہ کرو پھر افسوس
 متصل ہو سکے تو ہم سے ملاقات کرو
 بس بہت وقت گیا شعر کے فن میں ضائع
 میر اب پیر ہوئے توک خیالات کرو

مطرب نے پڑھی تھی غزل اک میر کی شب کو
 مجلس میں بہت وجد کی حالت رہی سب کو
 برسوں تئیں جب ہم نے ترد و کئے ہیں تب
 پہنچایا ہے آدم تئیں واعظ کے نسب کو
 حیرت ہے کہ ہے مدعی معرفت اک خلق
 کچھ ہم نے تو پایا نہیں اب تک ترے قہب کو
 ہوگا کسود یوار کے سائے میں پڑا میر
 کیا کام صحبت سے اُس آرام طلب کو

نہ نو طالع نہ جذب پھر دل کو
 کس بھروسے پہ تک تحصیل ہو
 لگ نہ چل اے نسیم باغ کہ میں
 رہ گیا ہوں چراغ سا گل ہو

دیر رہنے کی بجا نہیں پہ چمن
 بوئے گل ہو صنیر بلبل ہو
 مجھہ درانے کی مت ہلا زنجیر
 کہیں ایسا نہ ہو کہ پھر غل ہو

مت تربت میر کو ستاؤ
 دھنے دو غریب کا نشان تو

ہو کوئی بادشاہ کوئی یاں وزیر ہو
 اپنی بلا سے بیٹھ رہے جب فقیر ہو
 کس طرح آہ خاک مذلت سے میں اُتھوں
 افتادہ تر جو مجھہ سے مرادستگیر ہو
 حد سے زیادہ جور و ستم خوشنما نہیں
 ایسا سلوک کر کہ تدارک پذیر ہو
 دم بھر نہ تھیرے دل میں نہ آنکھوں میں ایک پل
 اتنے سے قد یہ تم بھی قیامت شریہ ہو
 اک وقت خاص حق میں مرے کچھہ دعا کرو
 تم بھی تو میر صاحب و قیلہ فقیر ہو

کیا کیا جوان ہم نے دنیا سے جاتے دیکھے
 اے عشق بے مجابا دنیا ہو اور تو ہو
 ایسے کہو گے کچھہ تو ہم چپکے ہو رہینگے
 ہر بات پر کہاں تک آپس میں گفتگو ہو

جنہش بھی اُس کے آگے ہونٹوں کو ہو تو کہیو
 یوں اپنے طور پر تم باتیں بہت بنا لو
 بازاری سارے دے ہی کہتے ہیں راز بیٹھ
 جن کو ہمیں کہا ہے تم مند سے مت نکالو

اس باغ کے ہر گل سے چپک جاتی ہیں آنکھیں
مشکل بنی ہے آن کے صاحب نظروں کو

کھنچا ہے آدمی نے بہت دور آپ کو
اس پردے میں خیال تو کر تک خدا نہ ہو

لطف شراب ابر سے ہے سو نصیب دیکھ
جب لیوین جام ہاتھ میں تب آفتاب ہو
ہستی پر ایک دم کی تمہیں جوش اس قدر
اس بحر موج خیز میں تم تو حباب ہو
قتل کئے پر غصہ کیا ہے لاش مری اُتھوانے دو
جان سے بھی ہم جاتے رہے ہیں تم بھی اُڑ جانے دو
اب کے بہت ہے شور بہاراں ہم کو مت زنجیر کرو
دل کی ہوس تک ہم بھی نکالیں دھو میں ہم کو مچانے دو
عرصہ کتنا سارے جہاں کا وحشت پر جو آجائیں
پاؤں تو ہم پھیلائیں گے پر فرصت ہم کو پانے دو
ضعف بہت ہے میر تمہیں کچھ اُس کی گلی میں مت جاؤ
صبر کرو تک اور بھی صاحب طاقت جی میں آنے دو
بات بگانا مشکل سا ہے شعر سبھی یاں کہتے ہیں
فکر بلند سے یاروں کو اک ایسی غزل کہہ لانے دو

یہ سرا سونے کی جاگہ نہیں بیدار رہو
ہم نے کردی ہے خبر تم کو خبردار رہو
لاگ اگر دل کو نہیں لطف نہیں جیلے کا
البتہ ساجھے کسو کا کل کے گرفتار رہو

بارے دنیا میں رہو غمزدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

ہم کو دیوانگی شہروں ہی میں خوش آتی ہے
 دشت میں قیس رہو کوہ میں فرہاد رہو
 وہ گراں خواب جو ہے ناز کا اپنے سو ہے
 داد بیداد رہو شب کو کہ فریاد رہو
 میر ہم مل کے بہت خوش ہوئے تم سے پیارے
 اس خرابے میں مری جان تم آباد رہو

کہتا ہے کون میر کہ بے اختیار رو
 ایسا تو رو کہ رونے پہ تیرے ہنسی نہ ہو
 اے غافلان دھر یہ کچھہ راہ کی ہے بات
 چلنے کو قافلے ہیں یہاں تم رہے ہو سو

حاصل کوئی اُمید ہوئی ہو تو میں کہوں
 خوں ہی ہوا کئے ہیں مرے دل میں سارے چاؤ

× کام کئے ہیں شوق سے ضائع صبر نہ آیا یاروں کو
 سار رکھا ہے تابی دل نے ہم سب غم کے ماروں کو

× جو نہ ہووے نماز کرئیے نیاز
 آدمی چاہئے کرے کچھہ تو
 طالع و جذب و زاری و زور و زور
 عشق میں چاہئے ارے کچھہ تو
 سہمے سہمے نظر پڑے ہیں میں
 اُس کے اطوار سے تارے کچھہ تو

کہتا ہوں وہاں صحبت رندانہ جہاں ہو
 میں خوش ہوں اُسی شہر سے میخانہ جہاں ہو

۱۰۵
 ۱۷۵۱
 رہنے سے مرے پاس کے بد نام ہوئے تم
 اب جا کے رہو واں کہیں رسوا نہ جہاں ہو
 ان اُجڑی ہوئی بستیوں میں دل نہیں لگتا
 ہے جی میں وہیں جا بسیں ویرانہ جہاں ہو
 وحشت ہے خرد مندوں کی صحبت سے مجھے میسر
 اب جا رہوں گا واں کوئی دیوانہ جہاں ہو

اپنے حسن رفتنی پر آج مت مغرور ہو
 پاس تو ہے جن کے وہی کل کہیں گے دور ہو
 دیکھ کر وہ راہ چلتا ہی نہیں تک ورنہ ہم
 پاؤں اُس کے آنکھوں پر رکھ لیں جو منظور ہو
 شہر دل کی کیا خرابی کا بیاں باہم کریں
 اس کو ویرانہ نہ کہئے جو کبھی معسور ہو

صوفیاں خم وا ہوئے ہیں ہاے آنکھیں وا کرو
 ابر آیا زور غیرت تم بھی تک پیدا کرو
 مستی و دیوانگی کا عہد ہے بازار میں
 پائے کوبان دست افشاں آن کر سودا کرو
 گر چہ ہم پر بستہ طائر ہیں پر اے گلہائے تر
 کچھ ہمیں پروا نہیں ہے تم اگر پروا کرو

اگلے سب چاہتے تھے ہم سے وفاداروں کو
 کچھ تمہیں پیار نہیں کرتے جفا ساروں کو

روز دفتر لکھے گئے بیاں سے
 اُن نے اک حرف بھی لکھا نہ کبھو
 گو شگفتہ چمن چمن تھے گل
 غنچہ دل تو وا ہوا نہ کبھو

۸۹/۵۲۳۱
 ۱-۱۵۲

ابتدا ہی میں مر گئے سب یار
عشق کی پائی انتہا نہ کبھو

نہ سسجھا گیا کھیل قدرت کا ہم سے
کیا اس کو بد خو بننا کر نکو دو
ہوا ابرو سبزے میں چشمک ھ گل کی
کریں ساز ہم برگ عیش لب جو
بہار آئی گل پھول سر جوڑ نکلے
دھیں باغ میں کاش اس رنگ ہم تو
دھے آبرو میو تو ھے غنیمت
کہ غارت میں دل کی ھے ایماے ابرو

آنا نہیں نظر کہ حصول اُمید ہو
کیا تھام تھام دکھئے دل بے قرار کو
جیتے دھے تو اُس سے ہم آغوش ہوں گے ہم
لبریز گل سے دیکھیں گے جیب و کنار کو
بولا کہ مجھکو کرتی ھے بد نام گور میو
ھے خوب اگر مٹا دے کوئی اس مزار کو

موسم ابرو ھو سبو بھی ھو
گل ھو گلشن ھو اور تو بھی ھو
کب تک آئیے گا یہ حسن قبول
منہ ترا اس طرف کبھو بھی ھو
ھو جو تیرا سا رنگ گل کا ھے
دیکھیں ہم تب جب ایسی بو بھی ھو
ھے غرض عشق صرف ہی لیکن
شرط یہ ھے کہ جستجو بھی ھو

سرد کشی گل کی خوش نہیں آتی
 ناز کرنے کو ویسا رو بھی ہو
 کس کو بلبل ہے دم کشی کا دماغ
 ہو تو گل ہی کی گفتگو بھی ہو
 دل تمنا کدہ تو ہے پر میں
 ہو تو اُس کی ہی آرزو بھی ہو

: O :

ردیف ۴

آگ تھے ابتداءے عشق میں ہم
 اب جو ہیں خاک انتہا ہے یہ
 بود آدم نمود شبلم ہے
 ایک دو دم میں پھر ہوا ہے یہ
 شکر اس کی چنا کا ہو نہ سکا
 دل سے اپنے ہمیں گلا ہے یہ
 شور سے اپنے حشر ہے پردہ
 یوں نہیں جانتا کہ کیا ہے یہ
 دیکھہ بیدم لگا مجھے کہنے
 ہے تو مردہ سا پر بلا ہے یہ
 میو کو کیوں نہ مغتنم جانے
 اگلے لوگوں میں اک رہا ہے یہ

ہم سے کچھہ آگے زمانے میں ہوا کیا کیا کچھہ
 تو بھی ہم غافلوں نے آگے کیا کیا کچھہ
 کیا کہوں تجھہ سے کہ کیا دیکھا ہے تجھہ میں میں نے
 عشوہ و غمزہ و انداز و ادا کیا کیا کچھہ
 دل گیا ہوش گیا صبر گیا جی بھر گیا
 شغل میں غم کے ترے ہم سے گیا کیا کیا کچھہ

نام ہیں خستہ و آوارہ و بدنام مرے
 ایک عالم نے غرض مجھ کو کہا کیا کچھ
 طرفہ صحبت ہے کہ سنتا نہیں تو ایک مری
 واسطے تیرے سنا میں نے سنا کیا کچھ
 حسرت وصل و غم ہجو و خیال رخ دوست
 مر گیا میں پہ مرے جی میں رہا کیا کچھ
 درد دل زخم جگر کلفت غم داغ فراق
 آہ عالم سے مرے ساتھ چلا کیا کچھ
 چشم نمناک و دل پر جگر صد پارہ
 دولت عشق سے ہم پاس بھی تھا کیا کچھ
 تجھ کو کیا بننے بگڑنے سے زمانے کے کہ یاں
 خاک کن کن کی ہوئی اور ہوا کیا کچھ
 قبلہ و کعبہ خداوند و ملاذو مشفق
 مضطرب ہو کے اُسے میں نے لکھا کیا کچھ
 پر کہوں کیا رقم شوق کی اپنے تاثیر
 ہر سر حرف پہ وہ کہنے لگا کیا کچھ
 ایک محروم چلے میرے ہمیں عالم سے
 ورنہ عالم کو زمانے نے دیا کیا کچھ

جی چاہ مل کسو سے یا سب سے تو جدا رہ
 پر ہوسکے تو پیارے تک دل کا آشنا رہ
 ہر مشقت خاک یاں کی چاہ ہے اک تامل
 بن سوچے راہ مت چل ہر گام پر کھڑا رہ
 شاید کہ سر بلندی ہووے نصیب تیرے
 جوں گرد راہ سب کے پاؤں سے تو لگا رہ
 دوڑے بہت و لیکن مطلب کو کون پہنچا
 آئندہ تو بھی ہم سا ہو کر شکستہ پارہ

کیا موافقی ہو دریا عشق کے بیمار کے ساتھ
 جی ہی جاتے نظر آتے ہیں اس آزار کے ساتھ
 رات مجلس میں تری ہم بھی کھڑے تھے چپکے
 جیسے تصویر لگا دے کوئی دیوار کے ساتھ
 کس کو ہر دم ہے لہو رونے کا ہجران میں دماغ
 دل کو اک ربط سا ہے دید، خو بار کے ساتھ

بندے کے درد دل کو کوئی نہیں پہنچتا
 ہر ایک بے حقیقت یاں ہے خدا رسیدہ
 ذوق سخن ہوا ہے اب تو بہت ہمیں بھی
 لکھ لیں گے میر جی کے کچھ شعر چیدہ چیدہ

لطف کیا ہر کسو کی چاہ کے ساتھ
 چاہ وہ ہے جو ہو نباہ کے ساتھ

کھینچتا ہے دلوں کو صحرا کچھ
 ہے مزاجوں میں اپنے سودہ کچھ
 ویسے ظاہر کا لطف ہے چھینا
 کم تماشا نہیں یہ پردا کچھ
 خلق کی کیا سمجھ میں وہ آیا
 آپ سے تو گیا نہ سمجھا کچھ
 کچھ نہ دیکھا تھا ہم نے پر تو بھی
 آنکھ میں آئی ہے نہ دنیا کچھ
 وصل اس کا خدا نصیب کریں
 میر جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ

بود نقش و نگار سا ہے کچھ
 صورت اک اعتبار سا ہے کچھ

یہ جنو مہمات جسے کہیں ہمیں عمر
دیکھو تو انتظار سا ہے کچھ
ضعف پوری میں زندگانی بھی
دوش پر اپنے بار سا ہے کچھ
کیا ہے دیکھو ہو جو ادھر ہر دم
اور چتون میں پیار سا ہے کچھ

ان اجڑی بستیوں میں دیوار دور ہیں کیا کیا
آثار جن کے ہیں یہ اُن کا نہیں اثر کچھ
واعظ نہ ہو معارض نیک و بد جہاں سے
جو ہو سکے تو غافل اپنا ہی فکر کر کچھ

یادوں کی آہ و زاری ہووے قبول کیوں کہ
ان کی زبان میں کچھ ہے دلمیں ہے کچھ دعا کچھ

ہم جانتے تو عشق نہ کرتے کسو کے ساتھ
لیجاتے دل کو خاک میں اس آرزو کے ساتھ
نازاں ہو اس کے سامنے کیا گل کہلا ہوا
رکھتا ہے لطف ناز بھی روے نکو کے ساتھ

گل گل شگفتہ مے سے ہے نگار دیکھ
یک جوعہ ہمدام اور پلا بہار دیکھ

ملتا رہا کشادہ جبین خوب روز و شب سے
کیا آئینہ کرے ہے بسرِ یان حیا کے ساتھ
گو دست لطف سر سے اٹھا لے کوئی شفیق
دل کا لگاؤ اپنا ہے دست دعا کے ساتھ

تدبیر دوستاں سے ہے بالعکس فائدہ
 ہے درد عاشقی خصوصت دوا کے ساتھ
 کیا جانوں میں چمن کو ولیکن قفس پہ سیر
 آتا ہے برگ گل کدیم کوئی صبا کیساتھ

—————:O:—————

ردیف و

خانہ دل سے زہار نجا
 کوئی ایسے مکان سے اُٹھتا ہے
 یوں اُٹھے آہ اس گلی سے ہم
 جیسے کوئی جہاں سے اُٹھتا ہے

سیغہ متجروح بھی قابل ہوا ہے سیر کے
 ایک دن تو آن کر یہ زخم سارے دیکھئے
 خنجر بیداد کو کیا دیکھتے ہو دمدم
 چشم سے انصاف کی سیغہ ہمارے دیکھئے

سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا ہم کو
 وگر نہ ہم خدا تے گہر دل بے مدعا ہوتے
 فلک اے کاش ہم کو خاک ہی دکھتا کہ اسمیں ہم
 غبار راہ ہوتے یا کسو کی خاک پاہوتے
 الہی کیسے ہوتے ہیں جنہیں ہے بندگی خواہش
 ہمیں تو شرم نامن گیر ہو تی ہے خدا ہوتے

کبھی وادی عشق دکھلائی ہے
 بہت خضر بھی دل میں گمراہ ہے
 جہاں سے تو رخت اقامت کو باندہ
 یہ منزل نہیں بے خبر راہ ہے

دل تسلی نہیں صدا درد
جلوے سب ہیٹکے داغ میں گل کے
سیر کر میر اس چمن کی شتاب
ہے خزاں بھی سراغ میں گل کے



قابل اغوش ستمدید گان
اشک سا پاکیزہ گہر چاہئے
عشق کے آثار میں اے بوالہوس
داغ بدل دست بسر چاہئے
شرط سلیقہ ہے ہر اک امر میں
عیب بھی کرنے کو ہنر چاہئے

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نساؤں شراب کی سی ہے
نازکی اُس کے لب کی کیا کہئے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
بار بار اُس کے در پہ جاتا ہوں
حالت اضطراب کی سی ہے
میں جو بولا کہا کہ یہ آواز
اُسی خانہ خراب کی سی ہے
میر ان نوم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

اب جو اک حسرت جوانی ہے
عمر رفتہ کی یہ نشانی ہے
دشک یوسف ہے آہ وقت عزیز
عمر اک بار کاردانی ہے

گریہ ہر وقت کا نہیں بے ہیچ
 دل میں کوئی غم نہانی ہے
 اُس کی شمشیر نیز ہے ہمد
 مہر رہیں گے جو زندگانی ہے

اُس کے ایسے عہد تک نہ جیے
 عمر نے ہم سے بے وفائی کی
 وصل کے دن کی آرزو ہی رہی
 شب نہ آخر ہوئی جدائی کی

دل کی معموری کی مت کر فکر فوصت چاہئے
 ایسے ویرانے کے اب بسنے کو مدت چاہئے
 عاقبت فرہاد مہر کر کام اپنا کر آیا
 آدمی ہوے کسی پیشے میں جرأت چاہئے
 غو طرف متجھ پہلوان شاعر کا کب عاجز سخن
 سامنے ہونے کو صاحب فن کے قدرت چاہئے
 عشق میں وصل و جدائی سے نہیں کچھ گفتگو
 قرب و بعد اس جا برابر محبت چاہئے

نہری گلی سے جب ہم عزم سفر کریں گے
 ہر ہر قدم کے اوپر پتھر جگر کریں گے
 آرزوہ خاطرہوں سے کیا فائدہ سخن کا
 تم حرف سر کرو گے ہم گریہ سر کریں گے
 اپنے بھی جی ہے آخر انصاف کر کہ کب تک
 تو یہ ستم کرے گا ہم در گزر کریں گے
 صلاح طرفہ ہیں ہم عالم میں دیکھتے کے
 جو میسر جی لگے گا تو سب ہنر کریں گے

یاں سر کشاں جو صاحب ناچ ولوا ہوئے
 پامال ہو گئے تو نہ جانا کہ کیا ہوئے
 دیکھی نہ ایک چشمک گل ہی چمن میں آہ
 ہم آخر بہار قفس سے رہا ہوئے
 بچتاوگے بہت جو گئے ہم جہان سے
 آدم کی قدر ہوتی ہے ظاہر جدا ہوئے
 تجھ بن دماغ صحبت اہل چمن نہ تھا
 گل وا ہوئے ہزار ولے ہم نہ وا ہوئے

کل میر نے کیا کیا کی مے کے لئے بیتابی
 آخر کو گرہ رکھا سجادۂ سحرابی
 جاگا کہیں وہ بھی شب مرتکب سے ہو
 یہ بات سجدہاں ہی ہے اُن آنکھوں کی بیخوابی
 کیا شہر میں گنجائش مجھ ہے سرو پا کو ہو
 اب بڑے گئے ہیں میرے اسباب کم اسبابی
 دن رات میری چھاتی جلتی ہے محبت میں
 کیا ورنہ تھی جاگہ یہ آگ جو یاں دابی
 سو تلک پھرا لیکن پائی نہ وفا اک جا
 جی کہا گئی ہے میرا اس جنس کی نایابی
 جنگل ہی ہرے تلہا رونے سے نہیں میرے
 کوہوں کی کمر تک بھی جا پہنچی ہے سیرابی
 تھے ماہ و شاں کل جوان کو تھوں پہ جاوے میں
 ہے خاک سے آج اُن کی ہر صحن میں مہتابی
 کل میر جو یاں آیا، طور اُس کا بہت بھایا
 وہ خشک، لپی نس پر جامہ گلے میں آبی

کہاں ہیں آدمی عالم میں پیدا
 خدائی مددے کی انسان پر سے

خوب ہے اے ابر یک شب آؤ باہم روئیے
 یہ نہ اتنا بھی کہ دوپے شہر کم کم روئیے
 وقت خوش دیکھا نہ اکدم سے زیادہ دھر میں
 خندہ صبح چمن پر مثل شبنم روئیے
 شادی و غم میں جہاں کی ایک سے دس گاہے فرق
 عید کے دن ہنسیئے تو دس دن محرم روئیے
 دیکھا ماتم خانہ عالم کو ہم مانگہ ابر
 ہر جگہ پر جی میں یوں آیا دامادم روئیے
 اب سے یوں کرئیے مقدر اُٹھئے جب کہسارے
 وادی معنوں پہ اے ابر اک دم روئیے

برقعے اُٹھا چہرے سے وہ بت اگر آوے
 اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آوے
 اے ناقہ لیلیٰ دو قدم راہ غلط کر
 معنوں زخود رفتہ کبھو راہ پر آوے
 مسکن نہیں آرام دے بیتابی جگر کی
 جب تک نہ پلک پر کوئی تکتا نظر آوے
 کہتے ہیں ترے کوچے سے میرا آنے کہے
 جب جائے وہ خانہ خراب اپنے گھر آوے

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے
 اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے
 صباغ ہیں سب خوار از انجسلہ ہوں میں بھی
 ہے عیب بڑا اُس میں جسے کچھ ہنر آوے
 اے وہ کہ تو بیٹھا ہے سر راہ پہ زہار
 کبھو جو کبھو میرا بلا کش ادھر آوے
 بہشت دشت محبت میں قدم رکھے کہ خضر کو
 ہر گام پہ اس راہ میں سفر سے حذر آوے

حرم کو جائیے یا دیر میں بسر کرئیے
 تری تلاش میں اک دل کدھر کدھر کرئیے
 کتے ھے دیکھئے یوں عمر کب تلک اپنی
 کہ سنئے نام ترا اور چشم تر کرئیے
 ہوا ھے دن تو جدائی کا سو تعب سے شام
 شب فراق کس امید پر سحر کرئیے

ہوں گرم سفر شام غریباں سے خوشی ہوں
 اے صبح وطن تو تو مجھے بے وطنی ھے
 ہر چند گداہوں میں ترے عشق میں لیکن
 ان بوالہوسوں میں کوئی مکتبہ سا بھی غلی ھے
 ہر اشک مرا ھے در شہوار سے بہتر
 ہر لخت جگر رشک عقیق یمنی ھے

اب کر کے فراموش تو ناشاد کروگے
 پر ہم جو نہ ہوں گے تو بہت یاد کروگے
 گر دیکھو گے تم طرز کلام اُس کی نظر کر
 اے اہل سخن میر کو استاد کروگے

ایسی ہستی عدم میں داخل ھے
 نے جواں ہم نہ طفل شیر ہوئے
 یکدم تھی نمود و بود اپنی
 یا سفیدی کی یا اخیر ہوئے
 یعنی مانند صبح دنیا میں
 ہم جو پیدا ہوئے سو پیر ہوئے

مت مل اہل دول کے لڑکوں سے
 میر جی اُن سے مل فقیر ہوئے

جبکہ پہلو سے یار اُٹھتا ہے
 درد بے اختیار اُٹھتا ہے
 اب تاک بھی مزار مجنوں سے
 نا توں ایک غبار اُٹھتا ہے
 بگولا غبار کس کا میسر
 کہ جو ہو بے قرار اُٹھتا ہے

ایک سے ہے خرم غم دانہ اشک ایک سے
 دیدہ و دل الغرض دونوں کا حاصل ایک ہے

ہم نے بھی سیر کی تھی چمن کی، پر اے نسیم
 اُٹھتے ہی آشیاں سے گرفتار ہو گئے

دل عجب جائے ہے و لیکن مفت
 ہاتھ سے یہ مکان جاتا ہے
 کیا خوابی ہے میکدے کی سہل
 محتسب اک جہاں جانا ہے
 اس سخن ناشنو سے کیا کہئیے
 غیر کی بات مان جانا ہے

اے حب جاہ والو جو آج تا جور ہے
 کل اس کو دیکھیو تم نے تاج ہے نہ سر ہے
 ابکے ہوئے گل میں سیرابی ہے نہایت
 جوئے چمن پہ سبزہ مژگان چشم تر ہے
 اے ہم صغیر بے گل کس کو دماغ نالہ
 مدت ہوئی ہساری منقار زیر پر ہے
 شمع اخیر شب ہوں سن سر گزشت میری
 پھر صبح ہوتے تک تو قصہ ہی مختصر ہے

اب رحم پر اُسی کے موقوف ہے کہ یاں تو
 نے اشک میں سرایت نے آہ میں اثر ہے
 ہر دم قدم کو اپنے دکھ احتیاط سے یاں
 پہ گار گار ساری دکان شیشہ گر ہے

بحث ہے نا قصوں سے کاش فلک
 مجھ کو اس زمرے سے نکال رکھے
 سمجھ انداز شعر کو مرے
 میر کا سا اگر کمال رکھے

کچھ موج ہوا پیچھا اے میر نظر آئی
 شاید کے بہار آئی زنجیر نظر آئی
 دلی کے نہ تھے کو چہ ادراک مصور تھے
 جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

پہرتے پہرتے عاقبت آنکھیں ہماری مند گئیں
 سو گئے بے ہوش تھے ہم رہ کے ہارے ہوئے
 پیار کرنے کا جو خواب ہم پہ رکھتے ہیں گناہ
 اُن سے بھی تو پوچھئے تم اتنے کیوں پیارے ہوئے

جرس راہ میں جملہ تن شور ہے
 مگر قافلے سے کوئی دور ہے
 تمنائے دل کے لیے جان دی
 سلیقہ ہمارا تو مشہور ہے

دل اپنا نہایت ہے نازک مزاج
 گرا کر یہ شیشہ تو پھر چور ہے
 بہت سعی کرئیے تو مر رہئے میر
 بس اپنا تو اتنا ہے مقدور ہے

گفتگو ریختے میں ہم سے نہ کر
یہ ہماری زبان ہے پیارے
شکلیں کیا کیا کیا ہیں جن نے خاک
یہ وہی آسمان ہے پیارے
پیر تبسم کے کرنے سے نڈرے
کلیج لب پر گمان ہے پیارے
میر عمدہ بھی کوئی مرتا ہے
جان ہے تو جہان ہے پیارے

ہر قطعہ چمن پر تک گاز کر نظر کر
ہمیں ہزار شکلیں تب پہول کے بنائے
یک حرف کی بھی مہلت ہم کو نہ دی اجل نے
تھا جی میں آہ کیا کیا پر کچھ نہ کہنے پائے
آگے بھی تجھ سے تھا یاں تصویر کا سا عالم
بیدادی فلک نے دے نقش سب مقائے
اعجاز عشق ہی سے جیتے رہے وگرنہ
کیا حوصلہ کہ جس میں آزار یہ سمائے
دل گرمیاں انہوں کی غیروں سے جب نہ تب تھیں
مجاس میں جب گئے ہم غیرت نے جی چلاے

غالب کہ یہ دل خستہ شب ہجر میں مر جائے
یہ رات نہیں وہ جو کہانی میں گزر جائے
نہ بتکدہ ہے منزل مقصود نہ کعبہ
جو کوئی تلاشی ہو ترا آہ کدھر جائے
یا قوت کوئی ان کو کہے ہے کوئی گلبرگ
تک ہونٹ ہلا تو بھی کہ اک بات تھہر جائے
اس درطے سے تختہ جو کوئی پہنچے کنارے
تو میر وطن میرے بھی شاید یہ خبر جائے

ہو گئی شہر شہر رسوائی
 اے مری موت تو بھلی آئی
 یک بیاباں بزرگ صوت جرس
 منجھہ پہ ہے بیکسی و تنہائی
 میوے جب سے گپا ہے دل تب سے
 میں تو کچھ ہو گیا ہوں سودائی

میں نے اس قطعہ صناع سے سر کھینچا ہے
 کہ ہر اک کوچے میں جس کے تھے ہنرور کتنے
 تو ہے بیچارہ گدا میوے ترا کیا مذکور
 مل گئے خاک میں یاں صاحب افسر کتنے

اے شب ہجر راست کہہ تجھے کو
 بات کچھ صبح کی بھی آئی ہے
 چشم بدور و چشم تر اے میوے
 آنکھیں طوفان کو دکھاتی ہیں

جیب اور آستین سے رونے کا کام گزرا
 سارا نچوڑ اب تو دامن پہ آ رہا ہے
 کالے کا پاس اب تو رسوائی دور پہنچی
 راز محبت اپنا کس سے چھپا رہا ہے

توفیٰ بھی دیکھا نہ بسمل کا اپنے
 میں کشتہ ہوں انداز قاتل کا اپنے
 دل زخم خوردہ کے اور اک لگائی
 مداوا کیا خوب گھائل کا اپنے
 بنائیں رکھیں میں نے عالم میں کیا کیا
 ہوں بندہ خیالات باطل کا اپنے

رات گزری ہے مجھے نزع میں دوتے دوتے
 آنکھیں پھر جائیں گی اب صبح کے ہوتے ہوتے
 کھول کر آنکھہ آرا دید جہاں کا غافل
 خواب ہو جائے گا پھر جاگنا سوتے سوتے

اُڑے خاک گاہے رہے گاہ ویراں
 خراب و پریشان یہاں کی طرح ہے
 تعلق کرو میر اس پر جو چاہو
 مری جان یہ کچھہ جہاں کی طرح ہے

حصول کام کا دلخواہ یاں ہوا بھی ہے
 ساجت اتنی بھی سب سے کوئی خدا بھی ہے
 اُداسیاں تھیں مری خانقہ میں قابل سیر
 صنم کدے میں تو تک آ کے دل لگا بھی ہے
 یہ کہئے کیونکہ کہ خوباں سے کچھہ نہیں مطلب
 لگے جو پھرتے ہیں ہم کچھہ تو مدعا بھی ہے
 ترا ہے وہم کہ میں اپنے پورھن میں ہوں
 نگاہ غور سے کر مجھہ میں کچھہ رہا بھی ہے
 گزار شہر وفا میں سمجھہ کے کر معنوں
 کہ اس دیار میں میر شکستہ پا بھی ہے

صید افکنوں سے ملنے کی تدبیر کریں گے
 اس دل کے تئیں پیشکش تیر کریں گے
 فریاد اسیران محبت نہیں ہے ہیچ
 یہ نالے کسودل میں بھی تاثیر کریں گے
 دیوانگی کی شورشیں دکھلائیں گے بلبل
 آتی ہے بہار اب ہمیں زنجیر کریں گے

دسوائی عاشق سے تسلی نہیں خوباں
مر جاوے گا تو نعلش کو تشہیر کریں گے

یارب وہ بھی دن ہوگا کہ جو مصر سے چلکر
کنعان کی طرف قافلے شبگیر کریں گے
باز پیچہ نہیں میز کے احوال کا لکھنا
اس قصے کو ہم کرتے ہی تحریر کریں گے

یہ جہل دیکھ کہ اُن سمجھ میں اُٹھا لایا
گراں وہ بار جو تھا بیش اپنی طاقت سے
جو سوچے تک تو وہ مطلوب ہم ہی نکلے میز
خراب پھرتے تھے جسکی طلب میں مدت سے

مری خلق متحدہ کلام سب مجھے چھوڑتے ہیں خدوش کب
مرا حرف رشک کتاب ہے مری بات لکھنے کا باب ہے
جو وہ لکھتا کچھ بھی تو نامہ پر کوئی دھتی مذہ میں تری زبان
تری خامشی سے یہ نکلے ہے کہ جواب خط کا جواب ہے
نہیں کھلتیں آنکھیں تمہاری تک کہ مآل پر بھی نظر کرو
یہ جو دھم کی سی نسود ہے اسے خوب دیکھو تو خواب ہے
گئے وقت آتے ہیں ہاتھ کب ہوے ان کو گنوا کے خراب سب
تجھے کرنا ہوے سو کر تو اب کہ یہ عمر برق شتاب ہے
کبھو لطف سے نہ سخن کیا کبھو بات کہہ نہ لگا لیا
یہی لحظہ لحظہ خطاب ہے وہی لستہ لستہ عتاب ہے
تو جہاں کے بھر عمیق میں سر پر ہوا نہ بلند کر
کہ یہ پنج روزہ جو بود ہے کسو سوچ پر کا حباب ہے
دکھو آرزو مے خام کی کرو گفتگو خط جام کی
کہ سیاہ کاروں سے حشر میں نہ حساب ہے نہ کتاب ہے
مرا شور سن کے جو لوگوں نے کیا پوچھنا تو کہے ہے کیا
جسے میر کہتے ہیں صاحبو یہ وہی تو خانہ خراب ہے

روشن ہے جلکے مرنا پروانے کا و لیکن
 اے شمع کچھ تو کہہ تو تیری بھی تو زباں ہے
 بہرے ہے آتش گل اے ابر تر ترحم
 گوشے میں گلستان کے میرا بھی آشیان ہے
 پیور مغان! سعادت تیری جو ایسا آوے
 یہ میر میکشوں میں اک طرز کا جوان ہے

دل کس طرح نہ کہیںچیں اشعار ریختے کے
 بہتر کیا ہے میں نے اُس عیب کو ہنر سے
 انجام کار بلبیل دیکھا ہم اپنی آنکھوں
 آوارہ تھے چمن میں دو چار توتے پر سے
 بے طاقتی نے دل کی آخر کو مار رکھا
 آفت ہمارے جی کی آئی ہمارے گھر سے
 دلکش یہ منزل آخر دیکھا تو راہ نکلی
 سب یار جا چکے تھے آے جو ہم سفر سے

ناصر کو خبر کیا ہے لذت سے غم دل کی
 ہے حق بطرف اُس کے چکے تو مزا جانے
 بے طاقتی دل نے ہم کو نہ کیا رسوا
 ہے عشق سزا اُس کو جو کوئی چھپا جانے

نالہ عجز نقص الفت ہے
 رنج و محنت کمال راحت ہے
 تا دم مرگ غم خوشی کا نہیں
 دل آزرده گر سلامت ہے
 تیرا شکوہ مجھے نہ میرا تجھے
 چاہئے یوں جو فی الحقیقت ہے

تجھہ کو مسجد ھے مجھہ کو مے خانہ

واعظا اپنی اپنی قسمت ھے

تربت میر پر ہیں اہل سخن

ھر طرف حرف ھے حکایت ھے

تو بھی تقریب فاتحہ ھے چل

بخدا واجب الزیارت ھے

سچ پوچھو تو کب ھے گا اُس کا سا دھن غاچھ

تسکیں کے لئے ہم نے اک بات بنا لی ھے

میر میں جیتوں میں آوں گا اسی دن جس دن

دل نہ توڑے گا مرا چشم نہ بہر آئیگی

اس فن میں کوئی بے تہ کیا ہوا مرا معارض

اول تو میں سندھوں پھر یہ مری زباں ھے

طرف ہونا مرا مشکل ھے میر اس شعر کے فن میں

یونہی سودا کبھو ہوتا ھے سو جاہل ھے کیا جانے

کیا کروں شرح خستہ جانی کی

میں نے مر مر کے زندگانی کی

حال بد گفتنی نہیں میرا

تم نے پوچھا تو مہربانی کی

سب کو جانا ھے یوں تو پر اے صبر

آنی ھے اک تری جوانی کی

بیت بخشی سمجھہ کے کر بلبل

دھوم ھے میری خوش زبانی کی

جس سے کھوئی تھی نیند میر نے کل
ابتدا پھر وہی کہانی کی

کچھ تو کہہ وصل کی پیراں چلی جاتی ہے
دن گزر جائیں ہیں پر بات چلی جاتی ہے
رہ گئے گا تبسم پہ گہرے بات ہی پر
بارے اے ہمنشیں اوقات چلی جاتی ہے
روز آنے پہ نہیں نسبت عشقی موقوف
نہر بھر ایک ملاقات چلی جاتی ہے
خرقہ مندیل وردا مست لئے جاتے ہیں
شیخ کی ساری کرا مات چلی جاتی ہے

تم نے جو اپنے دل سے بھلا یا ہیں تو کیا
اپنے تئیں تو دل سے ہمارے بھلائیے
پہنچا تو ہو گا سمع مبارک میں حال میر
اس پر بھی جی میں آوے تو دل لگائیے

خانقہ کا تو نہ کر قصد تک اے خانہ خراب
یہی اک رہ گئی ہے بستی مسلمانوں کی
دل و دین کیسے کہ اُس رھزن دلہا سے اب
یہ پڑی ہے کہ خدا خیر کرے جانوں کی
سرگزشتیں نہ مری سن کہ اچھتی ہے نیند
خاصیت یہ ہے مری جان ان افسانوں کی
میکدے سے تو ابھی آیا ہے مسجد میں میر
نہ نہ لغزش کہیں مجلس ہے یہ بیگانوں کی

نہیں وہ اس جی گنوا نے کے
ہاے دے ذوق دل لگانے کے

میرے تغیر حال پر مت جا
 اتفاقات ہیں زمانے کے
 دم آخر ہی کیا نہ آنا تھا
 اور بھی وقت تھے بہانے کے
 اس کدورت کو ہم سمجھتے ہیں
 تھب ہیں یہ خاک میں ملانے کے
 دل و دیں ہوش و صبر سب ہی گئے
 آگے آگے تسہارے آنے کے

رہی نہ گفتہ مرے دل میں داستان میری
 نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زبان میری
 ب رنگ صوت چرس تجھ دور سے ہوں تنہا
 خبر نہیں ہے تجھے آہ کارواں میری
 ترے نہ آج کے آنے میں صبح کے مجھ پاس
 ہزار جائے گئی طبع بدگساں میری
 شب اس کے کوچے میں جاتا ہوں اس توقع پر
 کہ ایک دوست ہے واں خواب پاسباں میری
 اُسی سے دور رہا اصل مدعا جو تھا
 گئی یہ عمر عزیزا آہ رائیگاں میری
 ترے فراق میں جیسے خیال مفلس کا
 گئی ہے فکر پریشان کہاں کہاں میری

دل کو مت بھول جانا میرے بعد
 مجھ سے یہ یاد گار رہتا ہے
 دور میں چشم مسمت کے تیری
 فتنہ بھی ہوشیار رہتا ہے

آج کل بے قرار تھیں ہم بھی
 بیٹھ جا چلنے ہار تھیں ہم بھی
 آن میں کچھ تھیں آن میں کچھ تھیں
 تحفہ روزگار تھیں ہم بھی
 منع گریہ نہ کر تو اے ناصح
 اُس میں بے اختیار تھیں ہم بھی

غفلت میں گئی آہ مری ساری جوانی
 اے سرد گزشتہ میں تیری قدر نہ جانی
 دیکھیں توسہی کب تئیں نبیتی ہے یہ محبت
 ہم جی سے ترے دوست تھیں تو دشمن جانی
 اک شخص مجھی سا تھا کہ وہ تجھے پتہ تھا عاشق
 وہ اس کی وفا پیشگی وہ اُس کی جوانی
 یہ کہہ کے جو رویا تو لگا کہنے نہ کہہ میر
 سنتا نہیں میں ظالم رسیدوں کی کہانی

فقیرانہ آے صدا کر چلے
 میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے
 وہ کیا چیز ہے آہ جس کے لئے
 ہر اک چیز سے دل اُٹھا کر چلے
 کوئی ذمہ دار نہ کر کے نگاہ
 سو تم ہم سے منہ بھی چھپا کر چلے
 دکھائی دئیے یوں کہ بے خود کیا
 ہمیں آپ سے بھی جدا کر چلے
 جبین سجدے کرتے ہی کرتے گئی
 حق بندگی ہم ادا کر چلے
 پرستش کی یاں تک اے بت تجھے
 نظر میں سبھوں کی خدا کر چلے

گئی عمر در بند فکر غزل
سو اس فن کو ایسا بڑا کر چلے
کہیں کیا جو پوچھے کوئی ہم سے میسر
جہاں میں تم آئے تھے کیا کر چلے

کل بارے ہم سے اُس سے ملاقات ہو گئی
دو دو بچپن کے ہونے میں ایک بات ہو گئی
دُرِ ظلم سے کہ اس کی جزا بس شتاب ہے
آیا عمل میں یاں کہ مکافات ہو گئی
خورشید سا پیالہ مئے بے طلب دیا
پیر مغاں سے رات کرامات ہو گئی
اپنے تو ہونٹ بھی نہ ہلے اس کے رو برو
رنجش کی وجہ میسر وہ کیا بات ہو گئی

کوئی ہو محترم شوخی ترا تو میں پوچھوں
کہ بزم عیش جہاں کیا سمجھ کے برہم کی

جس جگہ دور جام ہوتا ہے
واں یہ عاجز مدام ہوتا ہے
ہم تو اک حرف کے نہیں مسنوں
کیسا خط و پیام ہوتا ہے
پوچھ مت آہ عاشقوں کی معاش
روز اُن کا بھی شام ہوتا ہے
زخم بن غم بن اور غصے بن
ایذا کھانا حرام ہوتا ہے
میسر صاحب بھی اُس کے ہاں تھے پر
جیسے کوئی غلام ہوتا ہے

حسرت لطف عزیزان چمن جی میں رہی
 سر پہ دیکھا نہ گل و سرو کا سایہ تم نے
 بعد اک عمر کہیں تم کو جو تنہا پایا
 دُرتے دُرتے ہی کچھہ احوال سنایا ہم نے
 یان فقط ریختہ ہی کہنے نہ آئے تھے ہم
 چار دن یہ بھی تماشا سا دکھایا ہم نے

نسبت تو دیتے ہیں ترے لب سے پر ایک دن
 ناموس یوں ہی جائے گی آب حیات کی
 صد حرف زیر خاک تہ دل چلے گئے
 مہلت نہ دی اجل نے ہمیں ایک بات کی
 ہم تو ہی اس زمانے میں حیرت سے چپ نہیں
 اب بات جاچکی ہے سبھی کائنات کی

کرو توکل کہ عاشقی میں نہ یوں کرو گے تو کیا کرو گے
 الم جو یہ ہے تو درد مندو! کہاں تلک تم دوا کرو گے
 جگر میں طاقت کہاں ہے اتنی کہ درد ہجراں سے مرتے دھتے
 ہزاروں وعدے وصال کے تھے کوئی بھی جیتے وفا کرو گے
 اخیر الفت یہی نہیں ہے کہ جل کے آخر ہئے پتنگیے
 ہوا جو یاں کی یہ ہے تو یارو غبار ہو کر آزا کرو گے

مصائب اور تھے پر دل کا جانا
 عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے
 سرہانے میسر کے آہستہ بولو
 ابھی تک روتے روتے سو گیا ہے

بہر ہم رہے شرابی سے
 دل پر خوں کی اک گلابی سے

کہلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
 اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے
 کام تھے عشق میں بہت پر میر
 ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

ہر کوئی اس مقام پر دس روز
 اپنی نوبت بجائے جاتا ہے
 جائے عبرت ہے خاکدان جہاں
 تو کہاں منہ اُٹھائے جاتا ہے
 دیکھہ سیلاب اس بیاباں کا
 کیسا سر کو جھکائے جاتا ہے

کعبے میں جاں بلب تھے ہم دورئی بتاں سے
 آئے ہیں پھر کے یارو اب کے خدا کے ہاں سے
 جب کوندھتی ہے بجلی تب جانب گلستاں
 دکھتی ہے چھپر میرے خاشاک آشیاں سے
 کیا خوبی اُس کے منہ کی اے فنچہ نقل کرئیے
 تو تو نہ بول ظالم ہو آتی ہے دہاں سے
 خاموشی ہی میں ہم نے دیکھی ہے مصلحت اب
 ہر اک سے حال دل کا مدت کہا زباں سے
 اتنی بھی بد مزاجی ہر لحظہ میر تم کو
 الجھاؤ ہے زمیں سے جھگڑا ہے آسماں سے

ہم گونہ ہوں جہاں میں آخر جہاں تو ہوگا
 تو نے بدی تو کی ہے ظالم بھلا کیا ہے

گرداب وار یار ترے صدقے جائیے
 دریا کا پھیر پائیے تیرا نہ پائیے

جو کفر جانتے تھے عشق بنناں کو وہ ہی
مسجد کے آگے آخر قشقہ لگا کے بیٹھے
کیا اپنی اور اُس کی اب نقل کرئیے صحبت
مجلس سے اُتھ گیا وہ تک ہم جو آ کے بیٹھے

شاید ب تکرور نے دل کے قصد آنکھوں کا کیا
کچھ سبب تو ہے جو آنسو آتے آتے تیم گئے
کیا معاش اس غمکدے میں ہم نے دس دن کی بہم
اُتھ کے جس کے ہاں گئے دل کا لئے ماتم گئے
ربط صاحب خانہ سے مطلق بہم پہنچا نہ میر
مدتوں سے ہم حرم میں تھے بد نا محترم گئے

تم چھپتے ہو بزم میں مجھ کو تو ہنسی سے
پر مجھ پہ جو ہو جائے ہے پوچھو مرے جی سے

کیا رنگ و بو و باد سکھ سب ہیں گرم راہ
کیا ہے جو اُس چمن میں ہے ایسی چلا چلی

تم نہیں فتنہ ساز سچ صاحب
شہر پر شور اُس غلام سے ہے
کوئی تجھ سا بھی کاش تجھ کو ملے
مدعا ہم کو انتقام سے ہے
شعر میرے ہیں سب خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے
سہل ہے میر کا سمجھنا کیا
ہر سخن اس کا اک مقام سے ہے

وہ جو پھرتا ہے مجھ سے دور ہی دور
ہے یہ تقریب جی کے جانے کی

کس کو کہتے ہیں نہیں میں جانتا اسلام و کفر
دیر ہو یا کعبہ مطلب مجھ کو تیرے در سے ہے
رحم بھی دینا تھا تھوڑا ہاے اس خوبی کے ساتھ
تجھ سے کیا کل گفتگو یہ داور محشر سے ہے
کیا کروں گا ابکے میں بے پر ہوس گلزار نی
لطف گلگشت اے نسیم صبح بال و پر سے ہے

چھاتی جلا کرے ہے سوڑ دروں بلا ہے
اک آگ سی رہے ہے کیا جائے کہ کیا ہے
میں اور تو ہیں دونوں مجبور طور اپنے
پیشا ترا جفا ہے شیوہ مرا وفا ہے
روئے سخن ہے کیدھر اہل جہاں کا یارب
سب متشوق ہیں اس پر ہر ایک کا خدا ہے
پھرتے ہو میو صاحب سب سے جدے جدے تم
شاید کہیں تمہارا دل اندنوں لگا ہے

اُس شوخ ستمگر کو کیا کوئی بھلا چاہے
جو چاہئے والے کا ہر طور برا چاہے
کعبے گئے کیا کوئی مقصد کو پہنچتا ہے
کیا سعی سے ہوتا ہے جب تک نہ خدا چاہے
دل جانے ہے جوں رو کر شبنم نے کہا گل سے
اب ہم تو چلے یاں سے رہ تو جو رہا چاہے

ہم طور عشق سے تو واقف نہیں ہیں لیکن
سینے میں جیسے دل کو کوئی ملا کرے ہے

گیا کہئے داغِ دل ہے نکرتے جگر ہے سارا
جانے و ہی جو کوئی ظالم وفا کرے ہے

یارِ بن تلخِ زندانی تھی
درستی مدعی جانی تھی
لطفِ پر اس کے ہم نشین مت جا
کچھو ہم پر بھی مہربانی تھی
شیب میں فائدہ تامل کا
سوچنا تب تھا جب جوانی تھی
میرے قصے سے سب کی نیندیں گئی ہیں
کچھ عجب طور کی کہانی تھی
عاشقی جی ہی لے گئی آخر
یہ بلا کوئی ناگہانی تھی
کوئے قاتل سے بچ کے نکلا خضر
اس میں اس کی زند گانی تھی
فقر پر بھی تھا میر کے اک رنگ
کفی پہنی سو زعفرانی تھی

جفا اس کی نہ پہنچی انتہا کو
دریغا سر نے کی بے وفائی

سارے دکھوں کی اے دل ہو جائیگی تلافی
صحبت ہماری اُس کی تک بھی اگر بنے ہے
پرسوں لگی ہوئی ہیں جب مہر و مہ کی آنکھیں
تب کوئی ہم سا صاحب صاحب نظر بنے ہے
یارانِ دیر و کعبہ دونوں بلا رہے ہیں
اب دیکھیں میر اپنا جانا کدھر بنے ہے

میو دریا ہے سنے شعر زبانی اُس کی
 اللہ اللہ دے طبیعت کی روانی اُس کی
 ایک ہے عہد میں ایسے وہ پروا گندہ مزاج
 اپنی آنکھوں میں نہ آیا کوئی ثانی اس کی
 مینہ تو بو چہار کا دیکھا ہے برستے تم نے
 اسی انداز سے تھی اشک نشانی اُس کی
 بات کی طرز کو دیکھو تو کوئی جادو تھا
 پر مای خاک میں سحر بیانی اُس کی
 اُس کا وہ عجز تسہارا یہ غرور خوبی
 منتیں اُس نے بہت کیں پہ نہ مانی اُس کی
 سرگزشت آپ ہی کس انداز سے سب کہتا تھا
 سو گئے تم نہ سنی ہائے کہانی اُس کی
 مرنے دل کے کئی کہہ کے دیئے لوگوں کو
 شہر دلی میں ہے سب پاس نشانی اُس کی
 ابلے کی سی طرح تھیس لگی پھوٹ بہرے
 درد مندی میں گئی ساری جوانی اُس کی
 اب گئے اسکے جز افسوس نہیں کچھ حاصل
 حیف صد حیف کہ کچھ قدر نہ جانی اُس کی

* مزاجوں میں یاس آگئی ہے ہمارے
 نہ مرنے کا غم ہے نہ جینے کی شادی

باؤ لے سے جب ملک بکتے تھے سب کرتے تھے پیار
 عقل کی باتیں کیا کیا ہم سے نادانی ہوئی

متدور تک توضبط کروں ہوں پہ کیا کروں
 منہ سے نکل ہی جاتی ہے اک بات پیار کی

تھا • ملک جن کے زیر نگیں صاف مت گئے
تم اس خیال میں ہو کہ نام و نشان رہے

جو خواہش نہ ہوتی نوکائش نہوتی
ہمیں جی سے مارا تری آرزو نے
نہ بھائیں تجھے مری باتیں و گرنہ
دکھی دھوم شہروں میں اس گفتگو نے
وہ کسریل کہ ہے شور جس گاہاں میں
پڑے ہینگے اس کے محل آج سونے
تری چال تیرے تری بات روکھی
تجھے میر سمجھا ہے یاں کم کسو نے

نو گرفتار ہوں اس باغ کا رحم اے صیاد
موسم گل رہے جب تک مجھے مہلت دیجے
اپنے ہی دل کا گنہ ہے جو جلاتا ہے مجھے
کس کر لے مرئیے میاں اور کسے تہمت دیجے

مرگ مجنوں سے عقل گم ہے میر
کیا دوانے موت پائی ہے

ہر طرف بحث تجھے سے ہے اے عشق
شکر تیرا تیری شکایت ہے
مت مراعات غیر رکھہ منظور
مرے حق میں یہی رعایت ہے

سر کسو سے فرو نہیں آتا
حیف بندے ہوئے خدا نہ ہوئے

جی کے لگنے کی میسر کچھ کہہ بھی
 ہے وہی بات جس میں ہو یہ بھی
 حسن اے رشک مہ نہیں رہتا
 چار دن کی ہے چاندنی یہ بھی

کرتی پھرے ہے رسوا سارے چمن میں مجھکو
 گر کوئی بات دل کی بلبل سے میں کہی ہے
 ہے صبح کا سا عرصہ پیری کا اس میں کیا ہرے
 باقی ہے وقت کتنا فرصت کہاں رہی ہے
 چلاہٹ اس طرح کی جز میسر کس سے ہووے
 باور نہیں تو دیکھو یہ ہو فہ ہو وہی ہے

اس کا غضب سے نامہ نہ اکھٹا تو سہل ہے
 لوگوں کے پوچھنے کا کوئی کیا جواب دے

نقد دل غفلت سے کھو یا راہ کھوٹی کر گئے
 کارواں جانا رہا ہم خواب ہی میں مر گئے
 کیا کہیں اس نے جو پھیرا اپنے در پر سے ہمیں
 مر گئے غیرت سے ہم بھی پر نہ اُس کے گھر گئے
 واعظ ناکس کی باتوں پر کوئی جاتا ہے میسر
 آؤ میخانے چلو تم کس کے کہنے پر گئے

اے کاش کوئی جا کر کہہ آوے یار سے بھی
 یاں کام جا چکا ہے اب اختیار سے بھی
 جان و جہاں سے گزرا میں میسر جن کی خاطر
 بچکر نکلتے ہیں دے میدے مزار سے بھی

حرف شنو ساتھ اپنے نہیں ہیں ورنہ درائے قافلہ ساں
 راہ میں باتیں کس کس ذہب کی کرتے ہیں ہم یاروں سے
 خستہ ہو اپنا کیسا ہی کوئی پھر بھی گلے سے لگاتے ہیں
 وحشت ایک تمہیں کو دیکھی اپنے سیفہ فگاروں سے

کچھ نہیں اور دیکھیں ہیں کیا کیا
 خواب کا سا ہے یاں کا عالم بھی

باغ میں سیر کبھو ہم بھی کیا کرتے تھے
 روش آب رواں پھیلے پھیرا کرتے تھے
 عیрт عشق کسو وقت بلا نہیں ہم کو
 تہوڑی آزدگی میں ترک وفا کرتے تھے
 دل کی بیماری سے خاطر تو ہماری تھی جمع
 لوگ کچھ یوں ہی محبت سے دوا کرتے تھے
 جب تلک شرم دھی مانع شوخی اس کی
 تب تلک ہم بھی ستم دیدہ حیا کرتے تھے
 مائل کفر جوانی میں بہت تھے ہم لوگ
 دیر میں مسجدوں میں دیر رہا کرتے تھے
 اب تو بیتابی دل نے ہمیں بٹھلا ہی دیا
 آگے رنج و تعب عشق اٹھا کرتے تھے
 اُتھ گئے پر مرے تکتے کو کہیں گے یاں میں
 درد دل بیٹھے کہانی سی کہا کرتے تھے

دنیا کی قدر کیا جو طلب گار ہو کوئی
 کچھ چیز ماں ہو تو خریدار ہو کوئی
 کیا ابر رحمت اب کے برستا ہے لطف سے
 طاعت گزین جو ہو سو گنہگار ہو کوئی

ہم عاشقانِ زرد و زبوں و نزار سے
مت کر ادا نہیں ایسی کہ بیزار ہو کوئی

چلو چمن میں جو دل کھلے تک بہم غم دل کہا کریں گے
طیور ہی سے بکا کریں گے گلوں کے آگے بکا کریں گے

سنو سرگزشت اب ہماری زبانی
سنی گرچہ جاتی نہیں یہ کہانی
ملا دیتی ہے خاک میں آدمی کو
محبت ہے کوئی بلا آسانی
گرامی گھر میو جی تھا ہمارا
ولے عشق میں قدر ہم نے نجانے

چلتے ہو تو چمن کو چلئے سنتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں پھول کھلے ہیں کم کم باد و باراں ہے

آگے کسو کے کیا کریں دست طمع دراز
وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

آرنے کی یک ہوس ہے ہم کو قفس سے ورنہ
شائستہ پریدن بازو میں پر کہاں ہے

فرہاد و قیس گزرے اب شور ہے ہمارا
ہر کوئی اپنی نوبت دو دن بجا گیا ہے

اے میو شعر کہنا کیا ہے کمال انسان
یہ بھی خیال سا کچھ خاطر میں آگیا ہے

شاعر نہیں جو دیکھا تو تو ہے کوئی ساحر
دو چار شعر پڑھ کر سب کو رچھا گیا ہے

پیدا کہاں ہے ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میوے سے صحبت نہیں رہی

دل کی بات کہی نہیں جاتی چپکے دھنسا تھانا ہے
حال اگر ہے ایسا ہی تو جی سے جانا جانا ہے
فرصت کم ہے یاں دھنسنے کی بات نہیں کچھ کہنے کی
آنکھیں کھول کے کان جو کھولو بزم جہاں افسانا ہے
فائدہ ہوگا کیا مترتب ناصح ہر ذہ درائی سے
کس کی نصیحت کون سنے ہے عاشق تو دیوانا ہے
تیغ تلے ہی اُس کے کیوں نہ گردن دال کے جا بیٹھیں
سر تو آخر کار ہمیں بھی خاک کے اور چھکانا ہے

میں اس کی جدائی میں تصدیع بہت پائی
درویشی و کم پائی بے صبری و تدہائی
تھا صبر و سکون جب تک دھنسا تھا مجھے غش سا
بیٹابی دل سر پر اک اور بلا لائی ہے

بوئے گل یا نوائے بلبل تھی
عمر افسوس کیا شتاب گئی

مجھے کو مارا بھلا کیا تونے
پر وفا کا برا کیا تونے
حسرتیں اس کی سر پٹکتی ہیں
مرگ فرہاد کیا کیا تو نے

آنکھوں کی طرف گوش کی در پردہ نظر ہے
 کچھہ یار کے آنے کی مگر گرم خبر ہے
 یہ راہِ روش سرو گلستان میں نہ ہوگی
 اس قامت دلچسپ کا انداز دگر ہے
 وہ ناوک دل دوز ہے لاگو مرے جی کا
 تو سامنے ہو ہمدام اگر تجھہ کو جگر ہے
 کیا جان کہ جس کے لئے مذہ مورئیں تم سے
 تم آؤ چلے داعیہ کچھہ تم کو اگر ہے
 شب شور و فغاں کرتے گئی مجھہ کو تواب تو
 دلکش ہو تک اے مرغ چمن وقت سحر ہے
 سوچے تھے کہ سودائے محبت میں ہے کچھہ سود
 اب دیکھتے ہیں اس میں تو جی ہی کا ضرر ہے
 شانے پہ رکھا ہار جو پھولوں کا تو لچکے
 کیا ساتھ نزاکت کے رگ گل سی کمر ہے
 کر کام کسو دل میں گئی عرش پہ تو کیا
 اے آہ سحر گاہ اگر تجھہ میں اثر ہے
 ہر بیت میں کیا میسر تری باتیں گتھی ہیں
 کچھہ اور سخن کرکہ غزل سلک گہر ہے

کیا خانہ خرابی کا ہمیں خوف و خطر ہے
 گہر ہے کسو گوشے میں تو مکتی کا سا گھر ہے
 اے شمع اقامت کدہ اس بزم کو مت جان
 روشن ہے تیرے چہرے سے تو گرم سفر ہے
 اس عاشق دیوانہ کی مت پوچھہ معیشت
 دندان بجگر دست بدل داغ بسر ہے
 کیا آگ کی چنگاریاں سیلے میں بھری ہیں
 جو آنسو مری آنکھہ سے گرتا ہے شرر ہے

ذرجان کا جس جا ہے وہیں گھر بھی ہے اپنا
ہم خانہ خرابوں کو نہ یاں گھر ہے نہ درہ

بزم میں سے اب تو چل اے رشک صبح
شمع کے اوپر بھری ہے مردنی
میں چراغ مستبگاہی ہوں نسیم
متجہ سے اکدم کے لئے کیا دشمنی

نہ یک شیخ اتنا بھی واقعی تباہی
کہاں رحمت حق کہاں بیگناہی
مجھے میرا گور کاندھا دیا تھا
تمنائے دل نے تو یاں تک نباہی

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے
مہر و وفا و لطف و عنایت ایک سے واقفان میں سے
اور تو سب کچھ، طنز و کنایہ و رموز اشارہ جانے ہے

ملوان دنوں ہم سے اک رات جانی
کہاں ہم کہاں تم کہاں پھر جوانی
شکایت کروں ہوں تو سونے لگے ہے
مری سرگزشت اب ہوئی ہے کہانی
ادا کہینچ سکتا ہے بہزاد اُس کی
کہنچے صورت ایسی تو یہ ہم نے مانی
ملاقات ہوتی ہے تو کشمکش سے
یہی ہم سے ہے جب نہ تب اینچا تانی

عالم عالم عشق و جنون ہے دنیا دنیا تہمت ہے
 دریا دریا روتا ہوں میں صحرا صحرا وحشت ہے
 ہوائے غیوری جس کی دیکھی جی ہی نکلتا ہے اپنا
 دیکھتے اس کی اور نہیں پھر عشق کی یہ بوی غیرت ہے
 صبح سے آنسو نویدانہ جیسے وداعی آتا تھا
 آج کسو خواہش کی شاید دل سے ہمارے رخصت ہے
 کیا دلکش ہے بزم جہانکی جاتے یاں سے جسے دیکھو
 وہ غمیدہ رنج کشیدہ آہ سراپا حسرت ہے
 آبکیات وہی نہ جس پر خضر و سکندر مرتے رہے
 خاک سے ہم نے بھرا وہ چشمہ یہ بھی ہماری تہمت ہے

گلستان کے ہمیں دونوں پلے بھرے
 بہار اس طرف اُس طرف ابر ہے
 در کعبہ پر کفر بکتا ہے میر
 مسلمان نہیں وہ کہیں گبر ہے

اپنے نیاز تم سے اب تک بتاں رہے تھے
 تم ہو خدائے باطل ہم بندے ہیں تمہارے
 تھیرے ہیں ہم تو متحرم تک پیار کر کے تم کو
 تم سے بھی کوئی پوچھے تم کیوں ہوئے پیارے
 کل میں جو سیر میں تھا کیا پھول پھول بیٹھے
 بلبل نے لی ہے گویا گلزار سب اجارے
 کرتا ہے ابر نیساں پر در دمن صدف کا
 منہ جو کوئی پسارے ایسے کئے پسارے
 ہوتی ہے صبح جو یاں ہے شام سے بھی بدتر
 کیا کہئے میر خرابی ایام کی ہمارے

داد فریاد جا بجا کرئیے
شاید اس کے بھی دل میں جا کرئیے

دیکھیں کب تک رہے ہ یہ صحبت
گالیاں کھاٹیے دعا کرئیے

کچھ کہیں تو کہے ہ یہ نہ کہو
کیونکر اظہار مدعا کرئیے

راہ تگمے کو بھی نہایت ہ
منتظر کب تلک رہا کرئیے

مستی موہوم و یک سر و گردن
سیکڑوں کیونکہ حق ادا کرئیے

وہ نہیں سرگزشت سلفا میسر
یوں کہانی سی کیا کہا کرئیے

مترتب ہو نفع جو کچھ بھی
دل کی بیماری کی دوا کرئیے

نالہ چب گرم کار ہوتا ہ
دل کلیجے کے پار ہوتا ہ

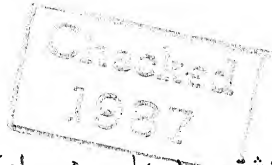
سب مزے در کنار عالم کے
یار جب ہم کنار ہوتا ہ

جبر ہ قہر ہ قیامت ہ
دل جو بے اختیار ہوتا ہ

اس صنایع کا اس بدایع کا
کچھ تعجب نہیں خدائی ہ

نہ تو جذب رسا نہ بخت رسا
کیوں کہ کہئے کہ واں رسائی ہ

میں نہ آتا تھا باغ میں اُس بن
مجھ کو بلبل پکار لائی ہ



گلِ قفس تک نسیم لائی ھے
 لو کہ بھر کر بہار آئی ھے
 عشقِ دریا ھے ایک لنگردار
 نہ کسو نے بھی اسکی پائی ھے
 وہ نہ شرمائے کب تاکِ آخر
 دوستی یاری آشنائی ھے
 وہ نہیں تو انہوں کا بھائی اور
 عشق کرنے کی کیا مڈائی ھے

یارب کوئی دیوانہ بے تھنگ سا آجاوے
 اغلال و سلاسل تک اپنی بھی ہلا جاوے
 خاموش رہیں کب تک زندان جہاں میں ہم
 ہلگامہ قیامت کا شورش سے اُٹھا جاوے
 عاشق میں ھے اور اس میں نسبت سگڑا ہوئی
 جوں جوں ہو رُمیدہ وہ توں توں یہ لگا جاوے
 کہئے جہاں کرتا ہو تاثیر سخن کچھہ بھی
 وہ بات نہیں سننا کیا اُس سے کہا جاوے
 ہم دیر کے جنگل میں بھولے پھرے ہیں کب تک
 کعبے کا ہمیں رستہ خضر آ کے بتا جاوے

ترے بندے ہم ہیں خدا جانتا ھے
 خدا جانے تو ہمکو کیا جانتا ھے
 نہیں عشق کا درد لذت سے خالی
 جسے ذوق ھے وہ مزا جانتا ھے
 کہے زیرِ برقع کہے گیسوؤں میں
 غرض خوب وہ منہ چھپا جانتا ھے
 مجھے جانے ھے آپ ساھی فریبی
 دعا کو بھی میری دعا جانتا ھے

جفا اس پہ کرتا ہے حد سے زیادہ
 جذبیں یار اہل وفا جانتا ہے
 لگالے ہے جھمکے دکھا کے اُسی کو
 جسے مغیبت چہ پار سا جانتا ہے
 اُسے جب نہ تب ہم نے بگڑا ہی پایا
 یہی اچھے منہ کو بڑا جانتا ہے
 بلا شور انگیز ہے چال اُس کی
 اُسی طرز کو خوش نما جانتا ہے
 نہ گرمی جلاتی تھی ایسی نہ سردی
 مجھے یار جیسا جلا جانتا ہے
 مردے دل میں دھتا ہے توہی تبھی تو
 جو کچھ دل کا ہے مدعا جانتا ہے
 جہاں میو عاشق ہوا خوار ہی تھا
 یہ سودائی کب دل لگا جانتا ہے

یہی عشق ہی جی کہتا جانتا ہے
 کہ جاناں سے بھی جی ملا جانتا ہے
 بدی میں بھی کچھ خوبی ہوویگی تب تو
 برا کرنے کو وہ بھلا جانتا ہے
 مرا شعر اچھا بھی دانستہ ضد سے
 کسو اور ہی کا کہا جانتا ہے
 زمانے کے اکثر ستمگار دیکھے
 وہی خوب طرز جفا جانتا ہے

دم میں جب تلک تھا سوچ رہا
 سانس کے ساتھ سارے سانسے گئے

یار نے ہم سے بے ادائیگی کی
 وصل کی رات میں لڑائی کی
 بال و پر بھی گئے بہار کے ساتھ
 اب توقع نہیں رہائی کی
 خندہ یار سے طرف ہو کر
 برق نے اپنی جگہ ہنسائی کی
 کوہکن کیا پہاڑ توڑے گا
 عشق نے زور آزمائی کی
 چپکے اس کی گلی میں پھرتے رہے
 دیرواں ہم نے بے نواہی کی
 میر کی بلندگی میں جانباہی
 سیر سنی ہو گئی خدائی کی

نہ دے لوگ ہیں اب نہ اجسام وہ
 جہاں وہ نہیں یہ جہاں اور ہے
 نہ ان لوگوں کی بات سمجھی گئی
 یہ خلق اور ان کی زبان اور ہے
 تجھے گو کہ صد رنگ ہو متجھے سے کہیں
 مرے اور اک مہرباں اور ہے
 ہوا رنگ بدلے ہے ہر آن میر
 زمیں و زمان ہر زمان اور ہے

کہو تو کب تئیں یوں ساتھ تیرے پیار رہے
 کہ دیکھ جب تجھے تب جی کو مار مار رہے
 ہوس اسیدروں کے تک دل کی نکلے کچھ شاید
 کوئی دن اور اگر موسم بہار رہے
 اٹھا جو باغ سے میں بے دماغ تو نہ پھرا
 ہزار مرغ گلستان مجھے پتار رہے

وصال و شجر تہہر جاوے کچھ نہ کچھ آخر
جو بے قرار مرے دل کو بھی قرار دے

جب سے جہاں ہے تب سے خرابی یہی ہے میر
تم دیکھ کر زمانے کو حیران کیا رہے

پہرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

گل نے کہا بہت کہ چمن سے نچائیے
گلگشت کو جو آئیے آنکھوں پر آئیے
میں بے دماغ کر کے تغافل چلا گیا
وہ دل کہاں کہ ناز کسو کے آٹھائیے
صحبت عجب طرح کی پڑی اتفاق ہائے
کہو بیٹھے جو آپ کو تو اس کو پائیے
خاطر ہی کے علاقے کی سب ہیں خرابیاں
اپنا ہو بس تو دل نہ کسو سے لگائیے
اے ہمدام ابتدا سے ہے آدم کشی میں عشق
طبع شریف اپنی نہ ایدہر کو لائیے
اندی بھی کیا ہے دیدہ درائی کہ غیر سے
آنکھیں لڑائیے ہمیں آنکھیں دکھائیے
مچلا ہے وہ تو دیکھ کے لبتا ہے آنکھیں موند
سوتا پڑا ہو کوئی تو اُس کو جگائیے

دل میں مسودے تھے بہت پر حضور یار
نکلا نہ ایک حرف بھی میری زبان سے
اول زمینوں میں ہو مائل میری طرف
جو حادثہ نزول کرے آسمان سے

وہ دل نہیں رہا ہے نہ وہ اب دماغ ہے
 جی تن میں اپنے بچھتا سا کوئی چراغ ہے
 یارب رکھینگے پنبہ مرہم کہاں کہاں
 سوز دروں سے ہائے بدن داغ داغ ہے
 مدت ہوئی کہ زانو سے اُٹھتا نہیں ہے سر
 کڑھنے سے رات دن کے ہمیں کب فراغ ہے
 گھر گھر پھرے ہے جہانکٹی ہر صبح جو نسیم
 پردے میں کوئی ہے کہ یہ اس کا سراغ ہے

طبیعت نے عجب کل یہ ادا کی
 کہ ساری رات وحشت ہی رہا کی
 نسائش داغ سودا کی ہے سر سے
 بہار اب ہے جنون کی ابتدا کی
 مجھی کو ملنے کا تہب کچھ نہ آیا
 نہیں تقصیر اُس نا آشنا کی
 گئے جل حر عشقی سے جگر دل
 دہی تھی جان سو برسوں جلا کی

ہم دو رو کے درد دل دیوانہ کہیں گے
 جی میں ہے کبھو حال غریبانہ کہیں گے
 سودائی و رسوا و شکستہ دل و خستہ
 اب لوگ ہمیں عشق میں کیا کیا نہ کہیں گے
 ہوں در بدر و خاک بسر چاک گریباں
 اس طور سے کیونکہ مجھے رسوا نہ کہیں گے
 ویرانے کو مدت کے کوئی کیا کرے تعمیر
 اُجڑی ہوئی آبادی کو ویرانہ کہیں گے
 موقوف غم میر کہ شب ہو چکی ہمدم
 کل رات کو پھر باقی یہ افسانہ کہیں گے

پامال لوگ آگے کیا کیا ہوئے ہیں تم سے
اس پر بھی تم جو آئے یاں تم نے سر اٹھائے

غم کبھو غم سے آہ کرتے تھے
آسمان تک سیاہ کرتے تھے
اے خوشا حال اس کا جس کا وہ
حال عسداً تباہ کرتے تھے
بوسوں دھتے تھے راہ میں اس کی
تب کچھ اک اس سے راہ کرتے تھے
نیچچی آنکھیں ہم اُس کو دیکھا کئے
کبھو اونچی نگاہ کرتے تھے
کیا زمانہ تھا وہ جو گزرا میسر
ہندگر لوگ چاہ کرتے تھے

چرخ پر اپنا مدار، دیکھئے کب تک رہ
ایسی طرح روزگار، دیکھئے کب تک رہے
سہرے کہاں تک پڑیں، آنسوؤں کے چہرے پر
گریہ گلے ہی کا سار، دیکھئے کب تک رہ
دوے سخن سب کا ہے، میری غزل کی طرف
شعر ہے میرا شعار، دیکھئے کب تک رہ
گیسو رخسار یار، آنکھوں ہی میں پھرتے ہیں
میر یہ لیل و نہار، دیکھئے کب تک رہ

بہت نا مہرباں دھتا ہے یعنی
تسارے حال پر کچھ مہرباں ہے
ہمیں جس جاے کل غش آگیا تھا
وہیں شاید کہ اُس کا آستان ہے

ہل ستم کے ہونا جور و جبر سی کرنا
 انصاف سے نہ کہنا یہ رسم ہے کہاں کی
 ہے سبز لب جو اس لطف سے چمن میں
 جوں ہی گنتی مسیں ہوں کوئی سرو نو جوان کی
 ہمیں گھر جہاں میں اپنے لڑکوں کے سے بنائے
 جب چاہا تب متایا بلیا د کیا جہاں کی
 جب سامنے گئے ہم ہم نے اسے دعا دی
 شکل اُن نے دیکھتے ہی غصہ کیا زباں کی

ہیگنی طلب شرط یاں ، کچھ تو کیا چاہئے
 بیٹھے نہیں بنتی میاں ، کچھ تو کیا چاہئے
 عشق میں آے ہسراں ، کچھ تو کیا چاہئے
 گریہ و شور و فغاں ، کچھ تو کیا چاہئے
 ہاتھ رکھ ہاتھ پر ، بیٹھے ہو کیا بے خبر
 چلنے کو ہے کارواں ، کچھ تو کیا چاہئے
 میں جو کہا تنگ ہوں ، مار مروں کیا کروں
 وہ بھی لگا کہنے ہاں ، کچھ تو کیا چاہئے
 کیا کروں دل خوں کروں ، شعر ہی موزوں کروں
 چلتی ہے اب تک زباں ، کچھ تو کیا چاہئے
 ہو نہ سکے گر نماز ، دل کی طرف کر نیاز
 وقت گیا پھر کہاں ، کچھ تو کیا چاہئے
 چاہوں کسو سے دعا ، دل کی کروں اب دوا
 نفع ہو پھر یا زباں ، کچھ تو کیا چاہئے
 یہ تو نہیں دوستی ، ہم سے جو تم کو رہی
 پاس دل دوستان ، کچھ تو کیا چاہئے
 میر نہیں پیر تم ، کالہی اللہ دے
 نام خدا ہو جوان ، کچھ تو کیا چاہئے

کرو تامل کہ حال ہم میں رہا نہیں ہے غموں کے مارے
 جو کچھ بھر و سا جنہوں پہ تھا سو شکیب و تاب و تو اس سدھارے
 ہوے ہیں غائب قیامت اب تو گئے جگر تک گئے ہیں دل تک
 جو تک بھی دیکھے وہ غور سے تو جداحت اس کو دکھا دیں سارے
 ہمارے آنکھیں بھی ہیں اتنی کہ اب ہے دریا محیط عالم
 کہیں کہیں جو رہے ہیں مردم سو بیٹھے ہیں وے گئے کنارے
 کریں تامل سو گاہے پر ہم مدام بے خود ہمیشہ غش ہے
 گئی ہے طاقت دلوں سے شاید نہیں ہے آیا جگر ہمارے
 کیجو سروں پر ہے تیغ نالہ کیجو سنان فغاں جگر پر
 کسو سے کہنے کا کچھ بھی حاصل گئے ہیں جوں توں کے وقت بارے
 بھری تھی آتش کہاں کی یارب دل و جگر میں کہ نصف شب کو
 لگا جو رونے تو جائے آنسو مری۔ مڑے سے گرے شرارے
 قبول عشق و محبت اتنا ہوا ہے اے میر سیر قایل
 مدام جاتے دکھائی دوں ہوں کیجو نہ اُن نے کہا کہ آ رہے

لالہ کنار دریا نکلا ہے کیا زمیں سے
 اُٹھتی نہیں ہیں آنکھیں دیکھو ادھر کہیں سے
 بالیدگی سے پہنچے گل آدمی کے سر تک
 ہو وار تو رنگ تپکے جیب اور آستیں سے
 خوش رنگ تر ہے ہر گل رخسار سے پری کے
 صد برگ و آن طرف ہے خورشید کی جبین سے
 صندل بھری جبین سے کیا صبح چہرہ ہو وے
 اس قطعہ چمن کے محبوب خوش نشیں سے
 جب میر جان دینا بوسے کے بدلے تھہرا
 تب خوف کیجئے کیا پیشانیوں کی چپیں سے

فردیات

دل گیا رسوا ہوئے آذر نہ سودا ہو گیا
اس دوروزہ زیست میں تم پر بھی کیا ہو گیا

آنے کے وقت تم تو کہیں بے کہیں رہے
اب آئے تم تو فائدہ ہم ہی نہیں رہے

× اُن نے دیکھا جو اُٹھکے سوتے سے
اُر گئے آئینے کے توتے سے

× بس نہ لگ چل نسیم مجھ سے کہ میں
رہ گیا ہوں چراغ سا بجھکر

مشہور ہیں عالم میں تو کیا ہیں بھی کہیں ہم
القصہ نہ درپے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

رباعیات

دامن عزلت کا اب لیا ہے میں نے
دل مرگ سے آشنا کیا ہے میں نے
تھا چشمے آب زندگانی نزدیک
پر خاک سے اس کو بھر دیا ہے میں نے

اُترا تھا غریبانہ کنارے آکر
لب خشک موا سو نور چشم حیدر
تر حلق دم آب سے اُس کا نہ ہوا
اے آب فرات خاک تیرے سر پر

بتخانے سے دل اپنے اُٹھائے نہ گئے
 کعبے کی طرف مزاج لائے نہ گئے
 طور مسجد کو برہمن کیا جانے
 یاں مدت عمر میں ہم آئے نہ گئے

چپکا چپکا پہرا نہ کر تو غم سے
 کیا حرف و سخن عیب ہے کچھ مکر سے
 آخر کو رکے دھتے جنوں ہوتا ہے
 اے میر کوئی بات کیا کر ہم سے

ہر لحظہ رلاتا ہے کڑھانا ہے مجھے
 ہر آن ستانا ہے کھپاتا ہے مجھے
 کل میں جو کہا رنج سے حاصل میرے
 بولا ترا آزاد خوش آتا ہے مجھے

دل جنکے بجا ہیں اُن کو آتی ہے خواب
 آرام خوش آتا ہے سہانی ہے خواب
 میں غمزدہ کیا اپنے دنوں کو روں
 میری تو جہاں شب ہوئی جاتی ہے خواب

ہم میر سے کہتے ہیں نہ تو رویا کر
 ہنس کھیل کے تک چین سے بھی سویا کر
 پایا نہیں جانے کا وہ در نایاب
 کڑا کڑا کے عبث جان کو مت کھویا کر

ہرچند کہ طاعت میں ہوا ہے تو پیر
 پر بات میری سن کہ نہیں ہے تاثیر

تسلیج بکف پھرنے سے کیا کام چلے
منکے کی طرح دل نہ پھرے جب تک میر

کیا میر تجھے جان ہوئی تھی بھاری
جو اُس بت سنگدل سے کی تھی یاری
بیسار بھلا کیا کوئی ہووے اُس کا
پرہیز کرے جس سے خدائی ساری

حیرت ہے کہ ہو رقیب محرم تیرا
ہمراز و انیس وقت و ہدم تیرا
جوں عکس ترے سامنے اکثر وہ ہو
جوں آئینہ منہ تکا کریں ہم تیرا

کچھ خواب سی ہے میر یہ صحبت داری
اُتھ جائینگے یہ بیٹھے ہوئے یکبارگی
کیا آنکھوں کو کھولا ہے تنک گوش کو کھول
افسانہ ہے پل مارتے مجالس ساری

دل خوں ہوا ضبط ہی کرتے کرتے
ہم ہوئی چکے دکھوں کے بھرتے بھرتے
اے مایہ زندگی ستم ہے یہ اگر
بہر آنکھ تجھے دیکھیں نہ مرتے مرتے

کیا کیا اے عاشقی ستایا تو نے
کیسا کیسا ہمیں کھپایا تو نے
اول کے سلوک میں کہیں کا نہ رکھا
آخر کو ٹھکانے ہی لگایا تو نے

ملیے اُس شخص سے جو آدم ہووے
 ناز اُس کو کمال پر بہت کم ہووے
 ہو گرم سخن تو گرد آوے یک خاق
 خاموش رہے تو ایک عالم ہووے

ہر صبح فسون میں شام کی ہے ہم نے
 خونباہہ کشی مدام کی ہے ہم نے
 یہ مہامت کم کہ جس کو کہتے ہیں عمر
 مر مر کے غرض تمام کی ہے ہم نے

ہیں گو کہ سبھی تسہاری پیاری باتیں
 پر جی سے نہ جائینگی تسہاری باتیں
 آنکھیں ہیں ادھر روئے سخن اور طرف
 یاروں کی نظر میں ہیں یہ ساری باتیں

ایسا نہ ہوا کہ ہم نے شادی کی ہو
 یا سیر بہار باغ وادی کی ہو
 پڑ مردہ کلی کے رنگ اس گلشن میں
 غالب ہے یہی کہ نامرادی کی ہو

مختصر میں اگر یہ آتشیں دم ہوگا
 حکامہ سب اک لپٹ میں برہم ہوگا
 تکلیف بہشت کاش مچھکوند کریں
 ورنہ وہ باغ بقی جہنم ہوگا

ہر صبح مرے سر پہ قیامت گزری
 ہر شام نئی ایک مصیبت گزری

پامال کدورت ہی رہا یاں دن رات
یوں خاک میں ملتے ہمکو مدت گزری

اُئی نہ کبھو رسم تَلطف تم کو
کرتے نہ سزا ہم یہ تاسف تم کو
مرتے ہیں اور منہ چھپاتے ہو تم
ہم سے اب تک بھی ھ تکلف تم کو

ہجراں میں کیا سب نے گذارا آخر
اسباب کیا جتنے کا سارا آخر
نے تاب رہی نہ صبر و یارا آخر
آخر کو ہوا کام ہمارا آخر

زانو پہ قدم خم شدہ سر کو لایا
جائے دندان کو ہم نے خالی پایا
آنکھوں کی بصارت میں تفاوت آیا
پوری نے عجب سماں ہمیں دکھلایا

وہ عہد گیا کہ جو ر اُس کے سہئے
وہ بات نہیں رہی کہ چپکے رہئے
جب جی ہی چلا تو صرفہ کیا ھ
بے صرفہ جو کچھ کہ منہ میں آئے کہئے

مسجد میں توشیح کو خروشاں دیکھا
میخانے میں جوش بادہ نوشاں دیکھا
اک گوشہ عافیت جہاں میں ہم نے
دیکھا تو محلہ خسوشاں دیکھا

جس وقت شروع یہ حکایت ہوگی
 نہایت کی ایک دگر نہایت ہوگی
 احوال وفا کا اپنی ہر گز مجھ سے
 مت پوچھ کہ کہنے میں شکایت ہوگی

گاہ کو کوئی خراب خواری ہوتا
 گاہ کو ہمیں یہ جاں بہاری ہوتا
 دلخواہ ملاپ ہوتا تو تو ملنے
 اے کاشکے عشق اختیاری ہوتا

یک مرتبہ دل پہ اضطرابی آئی
 یعنی کہ اجل مری شتابی آئی
 بکھرا جاتا ہے ناتوانی سے جی
 عاشق نہ ہوے کہ اک خرابی آئی

پھر عشق میں میو پاؤں دھرتا ہے گا
 جی اور منغض اپنا کرتا ہے گا
 سب مل کے بلا سے سمجھا آویں
 افسوس کہ وہ جوان مرتا ہے گا

چپکے رہنا نہ میر دل میں تھانو
 بولو چالو کہا ہمارا مانو
 اک حرف نہ کہہ سکو گئے وقت رفتن
 چلنے کو زبان کے غلیست جانو

کی حسن نے تجھ سے بے وفائی آخر
 خوبی نہ رہی نہ میر زائی آخر

درونق نہ رہی غبار خط سے منہ پر
اس سبز قدم نے خاک آزمائی آخر

یاروں کو کدورتیں ہیں اب تو ہم سے
جس روز کہ ہم جائینگے اس عالم سے
اس روز کھلیگی صاف سب پر یہ بات
اس بزم کی درونق تھی ہمارے دم سے

تیرا اے دل یہ غم فرو بھی ہوگا
اندیشہ رزق کم کبھو بھی ہوگا
کھانے کو دیا ہے آج حق نے تجھے کو
کل بھی دیوے گا کل جو تو بھی ہوگا

رنجش کی کوئی اس کی روایت نہ سنی
بے صرفہ کسو وقت حکایت نہ سنی
تھا میوے عجب فقیر صابر شاکر
ہم نے اس سے کبھو شکایت نہ سنی

مستزاد

دلی میں بہت سختی اب کے گزراں دل کو کر سنگ
غیور نہ رہی عاقبت گار نہ شاں کھینچا یہ فلک
یاروں میں نہ تھا کوئی مروت جو کرے اجڑے تھے کھر
تا مد نظر صاف پڑے تھے میدان عرصہ تھا تنگ

تا چند غم دل سے حکایت کرئیے ہو ہو کر تنگ
کس کس سے شب و روز شکایت کرئیے آقا ہے تنگ

سختی کوئی اے صدم کہانتک کیہنچے ہے جی میں کہ اب
ہو نالہ ترے دل میں سرایت کرئیے پر تو ہے سنگ

—: ۰ :—

منہ سائن

در شہر کا ماگفتہ شدہ

قابل ہے میری سیر کے اطوار روزگار
چالیں عجب طرح کی چاہیں عجب شعار
کرتا ہے بدسلوکی سبھوں سے یہ بے مدار
لاتا ہے روزِ فتنہ تازہ بروئے کار
دل داغ داغ دھتے ہیں اس سے جگر فگار
کاما سے تلخ کام اُٹھایا مرے تئیں
دلی میں بیدلانہ پھرایا مرے تئیں
ہم چشموں کی نظر سے گرایا مرے تئیں
حاصل کہ پیس سرمہ بقایا مرے تئیں
میں مشمت خاک مجھ سے اسے اسقدر غبار
لشکر میں مجھ کو شہر سے لایا پئے تلاش
یاں آگے گزری میری عجب طور سے معاش
پانی کسو سے مانگ پیا میں کسو سے آش
اس واقعے سے آگے اجل پہنچی ہوتی کاش
نا موس دھتی فتر کی، جاتا باعتبار
مدت رہا تھا ساتھ جنہوں کے خراب حال
دانستہ ان سبھوں نے کیا مجھ کو پائمال
آخر کو آیا مجھ میں انہوں میں نہت ملال
یہ زندگنی سہل ہوئی جان کی وبال
اس جمع میں کسو کو نہ پایا میں دستیار

جانا جہاں نہ تھا مجھے سو بارواں گیا
 ضعف قوی سے دست بدیوارواں گیا
 محتاج ہو کے ناں کا طلبگارواں گیا
 چارہ نہ دیکھا مضطر و ناچارواں گیا
 اس جان ناتواں پہ کیا صبر اختیار

در پر ہر اک دنی کے سماجت مری گئی
 نالایقوں سے ملتے لیاقت مری گئی
 کیا مفت ہائے شان شرافت مری گئی
 ایسا پھرایا اُن نے کہ طاقت مری گئی

مشہور شہراب ہوں سبکسار بے وقار
 عرصہ تھا مجھے یہ تلک اُٹھا ہو کے نسیمجاں
 پوچھا نہ مجھے کو یک لب ناں سے کنہوں نے یاں
 کم پائی پر بھی سیر کیا میں نے سب جہاں
 آشفته خاطری نے پھرایا کہاں کہاں
 برسوں کا راز مجھے سے ہوا آخر آشکار

پرواخت میری ہونہ سکی اک امیر سے
 عقدہ کھلا نہ دل کا دعائے فقیر سے
 فتنے ہمیشہ آتے رہے سر پہ تیر سے
 ہر چند التجا کی صغیر و کبیر سے
 لیکن ہوا نہ رفع مرے دل کا اضطراب

کن نے کی اپنے حال پہ شفقت سے ایک نگاہ
 نکلے ھے کس سے طور پر اپنے سخن کی راہ
 بولا نہ کوئی ہم سے کہ تم کیوں ہوئے تباہ
 اسلوب اپنے جینے کا ہو کس طرح سے آہ
 ہم ایک ناتواں وضعیف اور غم ہزار

حاجت مری روا دل پردرد نے نہ کی
 تاثیر اشک سرخ و رخ زرد نے نہ کی

تدبیر ایک دم بھی دم سرد نے نہ کی
 دلجوئی میری حیف کسی فرد نے نہ کی
 طاقت دہی نہ دل میں، گیا جان سے قرار
 ہر ترک شوخ چشم کرے مجھے یہ کب نظر
 ہر چلن بند باندھے مرے خوں پہ کیا کسر
 ہر دامدار قصد کرے یہ کہاں جگر
 یہ منہ نہیں کسی کا جو منہ کو کرے ادھر
 ہر کوئی جانتا ہے کسی کاہوں میں شکار
 دل سر بسر خراب ہے تعمیر کیا کروں
 آسفتگی حال کی تعمیر کیا کروں
 خونابہائے چشم کی تقریر کیا کروں
 زردئی رنگ چہرہ کی تحریر کیا کروں
 آیا جو میں چمن میں خزاں ہو گئی بہار
 حالت تو یہ کہ مجھے کو غصوں سے نہیں فراغ
 دل سوزش درونی سے جلتا ہے جوں چراغ
 سیدہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ
 ہے نام مجلسوں میں میرا میرے دماغ
 افسوس بے دماغی نے پایا ہے اشتہار

شہر آشوب

مشکل اپنی ہوئی جو بود و باش
 آئے لشکر میں ہم برائے تلاش
 آن کے دیکھی یاں کی طرفہ معاش
 ہے لب ناز پہ سو جگہ پر خاش
 نے دم آب ہے نہ چمچہ آس
 مرنے کے مرتبے میں ہیں احباب
 جو شناسا ملا سو بے اسباب

تنگدستی سے سب بحال خراب

جس کے ہے پال تو نہیں ہے طناب

جس کے ہے فرش تو نہیں ہے فراش

زندگانی ہوئی ہے سب پہ وبال

کدھرے جھینکے ہیں روتے ہیں بقال

پوچھے مت کچھ سپاہیوں کا حال

ایک تلوار نیچے ہے یک ڈھال

بادشاہ و وزیر سب قلاش

پیسے والے جو تھے ہوئے ہیں فقیر

تن سے ظاہر دگیں ہیں جیسی لکیر

ہیں معذب غرض صغیر و کبیر

مکھیاں سی گریں ہزاروں فقیر

دیکھیں تکرًا اگر برابر ماش

شور مطلق نہیں کسو سر میں

دور باقی نہ اسپ و اشتر میں

بھوک کا ذکر اقل و اکثر میں

خانہ جنگی سے امن لشکر میں

نہ کوئی رند ہے نہ کوئی اوباش

لعل خیمہ جو ہے سپہر اساس

پالیں ہیں رندیوں کی اس کے پاس

ہے زنا و شراب بے وسواس

دعب کر لیجئے یہیں سے قیاس

قصہ کوتاہ رئیس ہے عیاش

جتنے ہیں یاں اسیر بے دستور

پھر بکسن سلوک سب مشہور

پہنچنا ان تلک بہت ہے دور

بات کہنے کا واں کسے مقدور

حاصل ان سے نہ دل کو غیر خراش

چار لکھے ہیں مستعد کار
 دس تلمذ کیے جو ہوں تو ہے دربار
 ہیں وضع و شریف سارے خواہ
 لوت سے کچھ ہے گرمئی بازار
 سوہی قند سیاہ ہے یا ماش
 در پہ عمودوں کے روز و شب شور
 حرف یکسر فریب و رشوت خور
 بے لگے دیکھیں نے کسو کی اور
 مردہ شو پروہ سب کفن کے چور
 رحمت اللہ بر او لیں نباش
 یک بیک گر کسو کی موت آئی
 اس کے مردے کی پھر ہے رسوائی
 کیوں نہ پہنچے ہے جن کو اموائی
 سب وہ اولاد حاتم طائی
 کون دے کر کفن اُٹھاوے لاش
 بالضرورت گیا میں جس کے گھر
 آدمی کی نہ جنس تھا وہ خر
 بات کرنے لگا تو نیچی فطر
 بے مروت سفینہ مد نظر
 قابل صد ہزار شاش و تراش
 ہے جنہیں کچھ بھی رویت دربار
 سو فریبندہ مکرہی و غدار
 کاذب و مفت بر ہے دل آزار
 دُور ان کا ہے یہ کہ کریے خواہ
 کام ان کا یہ ہے خراش و تراش
 جس پہ تھہری ہے آکے سرداری
 ان سے ہم کو تھی چشم دلداری

معرفت ان کی بعد صد خواری
فرد دستخط ہوئی جو یک باری

جیسے کھینچے لکیریں کوئی نقاش

اس لکے کا نہیں ٹھکانا کچھ

وہم میں بھی نہیں ہے پانا کچھ

جس پہ دستخط نہ اُن نے جانا کچھ

بن نہ آیا مجھے بھانا کچھ

غیر اس کے لے آتھوں بشاش

واں سے آتھے کر میں پامال میں آیا

سخت تغییر حال میں آیا

بارہا یہ خیال میں آیا

کے زیاں شہ کے مال میں آیا

واسطے میرے سو مرایہ قماش

بخشدوں جامہ تک جو ہو قدرت

آتھوں آتے ہیں خرچ یک سامت

دس روپے دس گدا کو بے ملت

مقتضی ہوئے کب سری ہمت

صاحبان کرم کے تئیں شا باش

ہو جو اُن لوگوں میں گدا کا گزر

سہم رہ جائیں سب نہ دیکھیں ادھر

دیر کے بعد یہ کہیں ہل کر

شاہ جی لے خدا سمیوں کی خبر

سو بھی یہ بات ہے پس از گلگاش

یاروں کی جود کا بیاں کیا ہے

وہم میں اُن کے بھی جہاں کیا ہے

آشکارا ہے سب نہاں کیا ہے

دیکھتے ہیں کہیں کہ یاں کیا ہے

ایسی صحبت میں ہم نہ ہوتے کاش

بس قلم اب زباں کواپنی سنبھال
خوشنما کب ھے ایسے قال و مقال
ھے کڈھب چرخ روسیہ کی چال
مصلحت ھے کہ رھئے ھوکر لال
فائدہ کیا جو راز کریسے فاش

— 0 —

مثنویات

جھوٹ

اے جھوٹ آج شہر میں تیرا ہی دور ھے
شیوہ یہی سبھوں کا یہی سب کا طور ھے
اے جھوٹ تو شعار ھوا ساری خلق کا
کیا شہ کا کیا وزیر کا کیا اہل دلق کا
اے جھوٹ تجھہ سے ایک خرابی میں شہر ھے
اے جھوٹ تو غضب ھے قیامت ھے قہر ھے
اے جھوٹ رفتہ رفتہ ترا ھوگیا رواج
تیری متاع باب ھے ہر سو میں آج
اے جھوٹ کیا کہوں کہ بلا زیر سر ھے تو
اے جھوٹ سچ یہ ھے کہ عجب فتنہ گر ھے تو
اے جھوٹ کب ھے عرصے میں تجھہ سا حریف اب
تیرے ہی حکم کش ہیں وضع و شریف اب
اے جھوٹ تیرے شہر میں ہیں تابعین سبھی
مرجائے کیوں نہ کوئی وے سچ بولیں نے کبھی
کہنے سے آج اُن کے کوئی دل نہ شاد ھو
فردا کہیں تو اُس سے قیامت مراد ھو
وعدے گھڑی کے پہروں سب آزماچکے
برسوں تک انتظار کیا جی ھی جا چکے

اے جھوٹ رنگ تیرے کرے کوئی کیا بیاں
رکھتا ہے جھوٹے غنچہ زباں تو نہ زباں

یوسف کہ تھا نبی و صداقت شعار تھا

پھر حسن ظاہری سے وہ باغ و بہار تھا

پایان کار تیرے سبب چاک پیرہن

زنداں میں جا کے برسوں رہا چھوڑ کر وطن

اے جھوٹ تو تو ایک دلاویز ہے بلا

آشوب گاہ تجھ سے زمانہ سدا رہا

کس جانکئی سے کوہکنی کوہکن نے کی

تصویر کھود شیریں کے پیش نظر رکھی

نزدیک جب ہوا کہ وہ مطلوب سے ملے

اب صبح و شام غنچہ مقصود دل کھلے

دالہ کے تو پردے میں آ کام کر گیا

دو باتوں میں وہ عاشق دلخستہ ہو گیا

اے جھوٹ تجھ سے فتنے ہزاروں اُٹھا کیسے

ہنگامہ و فساد بھی ہر سو رہا کیسے

اے جھوٹ راستی سے نہیں گفتگو کہیں

کہنے کو ہاں کہیں ہیں حقیقت میں ہے نہیں

اے جھوٹ اس طرح میں بہت جی سے جا چکے

وعدے میں آہ لوگوں کے وعدے ہی آ چکے

اے جھوٹ اس زمانے میں کیونکر چلے معاش

ہے تنگ جھوٹ بولنے سے عرصہ تلاش

سردار جس سے سب متعلق ہے کاروبار

سچ بولنا ہے اُس کے تئیں سخت تنگ و عار

پھر سب مدار کار دروغی و مفتری

صدق و صفا و راستی کے عیب سے بری

مشکل حصول کام ہے یاں حاصل کلام

باتوں ہی باتوں کام ہوا خلق کا تمام

اے جھوٹ دل مرا بھی بہت درد ناک ہے
ان کاذبوں سے صبح نسط جیب چاک ہے

—: 0 :—

گھر کا حال

کیا لکھوں میرا اپنے گھر کا حال
اس خرابی میں ہوا پا مال
گھر کہ تاریک و تیرہ زندان ہے
سخت دل تنگ یوسف جاں ہے
کوچہ موج سے ہے آنگن تنگ
کوٹھری کے حباب کے سے تھنگ
چار دیواری سو جگہ سے خم
ترتنگ ہو تو سوکھتے ہیں ہم
لونی لگ لگ کے جھرنی ہے ماتی
آہ کیا عمر بے مزہ گاٹی
کیا تھمے مینہ سقف چھلنی تمام
چھت سے آنکھیں لگی رہے ہیں مدام
اس چکش کا علاج کیا کریئے
راکھ سے کب تلک گڑھے بھریئے
جا نہیں بیٹھے کو مینہ کے بھج
ہے چکش سے تمام ایوان کیچ
آنکھیں بھرا کے یہ کہیں ہیں سب
کیونکہ پردہ رہے گا یارب اب
جہاز باندھا ہے مینہ نے دن رات
گھر کی دیواریں ہیلگی جیسے پات
باؤ میں کانپتے ہیں جو تھر تھر
اُن پہ ردا رکھے کوئی کیونکر

کیچ لے لے کے بارے چھو پیا ہے
چھو پنا کا ہے کا ہے تھو پیا ہے

تسکو پھر پر چھتی بھی ہے ہی نہیں
توتا اک بوریا سا ڈالو کہیں

دھانکو دیوار یا اُتھا رکھو
یا ہمارے لیے بچھا رکھو

ایک حجرہ جو گھر میں ہے واثق
سوشکستہ تر از دل عاشق

کہیں سوراخ ہے کہیں ہے چاک
کہیں جھڑ جھڑ کے دھیر سی ہے خاک
کہیں گھونسیوں نے کھود ڈالا ہے
کہیں چوہے نے سر نکالا ہے

کہیں گھر ہے کسو چھچھوند ر کا
شور ہر کونے میں ہے مچھر کا
کونے توتے ہیں طاق پھوٹے ہیں
پتھر اپنی جگہ سے چھوٹے ہیں

انیت چونا کہیں سے گرتا ہے
جی اسی حجرے ہی میں پھرتا ہے
دکھ کے دیوار ایدھر اُردھر سے
لا کے یارب بنداؤں کس گھر سے

چار پائی جب اس میں بچھوائی
پہلے چلیا سہ ہی نظر آئی
* سام ابرص کہ ہے دوائے خراج
ہر جگہ یاں سے ہے نسایاں آج †

پیکر اپنی خدانے دکھی ہے
ڈانس اک ایک جیسی مکھی ہے

آگے اس حجرے کے ہے اک ایوان
 وہی اس ننگ خلق کا ہے مکان
 کڑی تختے سبھی دھوئیں سے سیا
 اس کی چہمت کی طرف ہمیشہ نگاہ
 کبھو کوئی سنہولیا ہے پھرے
 کبھو چہمت سے ہزار پائے گرے
 کوئی تختہ مکان سے توٹا ہے
 کوئی داسہ مکان سے چھوٹا ہے
 دب کے مرنا ہمیشہ مد نظر
 گھر کہاں صاف موت ہی کا گھر
 مٹی تودہ جو ڈالی چہمت پر ہم
 تے جو شہنشاہ جوں کمان میں خم
 مضطرب ہو کے جو بچھائی بہت
 عمر کڑی نے کڑی اُٹھائی بت
 پھر سے اس مٹی میں کرختی ہے
 تختہ تختہ ہوئی یہ سختی ہے
 دیں نہیں آوازیں پھر جو حد سے زیاد
 چل ستوں سے مکان دے ہے یاد
 اینٹ مٹی کا در کے آگے دھیر
 گرتی جانی ہے ہولے ہولے منڈیر
 جیتے ہیں جب تلک نہیں پہنچی
 ورنہ کیا بس ہے جو یہیں پہنچی
 کلنگی دیوار کی نپٹ بے حال
 پداری کا بوجھ بھی سکے نہ سنبھال
 طوطا، میٹھا تو ایک بابت ہے
 پودنا پھدکے تو قیامت ہے
 کیوں کہ ساون کٹے گا اب کی بار
 تہر تہراوے بھلہری سی دیوار

ہو گیا ہے جو اتنا ایسا
 شاق گزری ہے کیا کہوں کیسا
 ہو کے مضطرب لگے نہیں کہنے سب
 اُز بھنبیری کہ ساون آیا اب
 تپتیری یاں جو کوئی آتی ہے
 جان محزون نالی ہی جاتی ہے
 نہیں دیوار کا یہ اچھا تھلگ
 کہیں کہسکے تو ہے قیامت تلگ
 ایک دن ایک کو آ بیٹھا
 بے گماں جیسے ہوا آ بیٹھا
 چیل سے لوگ دوتے کرتے شور
 کہ نہ حایط میں کچھ رہا تھا زور
 ہو نہ ایسا کہ اپنی چال چلے
 دوتے اچھلے کہ حال حال چلے
 نہیں وہ زاغ چار پانوں پھرا
 ایک کالا پہاڑ آن گرا
 ستنی اس کی کہیں کہیں بھسکی
 جی دھا اور چھاتی بھی دھسکی
 سان کر خاک لگ گئے دو چار
 بارے جلدی درست کی دیوار
 اچھے ہوں گے کھنڈر بھی اس گھر سے
 رہے یک خرابی گھر در سے
 اُکھڑے پکھڑے کواڑ توٹی وید
 زلفی زنجیر ایک کہنہ جدید
 خاک لوہے کو جیسے کھارے پاک
 چھیر لیجے تو پھر نری ہے خاک
 بند رکھتا ہوں در جو گھر میں دھوں
 قدر کیا گھر کی جب کہ میں ہی نہ ہوں

گھر بھی پھر ایسا جیسا ہے مذکور
 ہے خرابے سے شہر میں مشہور
 جس سے پوچھو اُسے بتادے شتاب
 ساری بستی میں ہے یہی تو خراب
 ایک چہرہ ہے شہر دلی کا
 جیسے روضہ ہو شیخ چلی کا
 بانس کی جادے تھے سر کندے
 سووے مہنوں میں سب ہوئے تہندے
 تل کے بلند ہوں تھیلے سب
 پاکے رہنے لگے ہیں گیلے سب
 میڈہ میں کیوں نہ بھیگے یکسر
 پھوس بھی تو نہیں ہے چہر پر
 مٹی ہو کر گرا ہے سب والا
 وہ رہے یاں جو ہووے ذہب والا
 واں یہ تپکا تو یاں سرک بیٹھا
 یاں جو بھیگا تو واں تنک بیٹھا
 حال کس کو ہے اولتی کا یاد
 مگری اس جھگڑے میں گئی برباد
 کہیں صحنک دکھوں کہیں پیالا
 کہیں ہانڈی کے ٹھیکرے لالا
 تپکے دو چار جاتو بندکروں
 بینچ کوئی لڑاؤں فند کروں
 یاں تو جھانکے ہزار ہیں تنہا
 کچہہ نہیں ہاے مجہہ سے ہو سکتا
 بسکہ بدرنگ پٹکے ہے پانی
 کپڑے دھتے ہیں میرے افشانی
 کوئی جانے کہ ہولی کھیلا ہوں
 کوئی سمجھے ہے یہ کہ خیلہ ہوں

مجھ سے کیا واقعی ہوا چارا
 آسمان جو پتے تو کیا چارا
 بان جھینگر تمام چات گئے
 بھیگ کر بانس پھات پھات گئے
 نلکے جاندار ہیں جو بیش و کم
 تن پہ چڑیوں کو جلگ ہے باہم
 ایک کھینچے ہے چونچ سے کر زور
 ایک مگری پہ کر رہی ہے شور
 پوچھ مت زندگانی کیسی ہے
 ایسے چہر کی ایسی تہی ہے
 کیا کہوں جو جفا چکش سے سہی
 چار پائی ہمیشہ سر پہ رہی
 بویا پھیل کر بچھا نہ کبھو
 کونے ہی میں کھڑا رہا یک سو
 دیوڑھی کی یہ خوبی در ایسا
 چہر اس چو چلے کا گھر ایسا
 جلس اعلیٰ کوئی کہتولا کھات
 پائے پتی رہے ہیں جلکے پھات
 کھٹمنوں سے سیاہ ہے سو بھی
 چین پڑتا نہیں ہے شب کو بھی
 شب بچھو نا جو میں بچھا نا ہوں
 سر پہ روز سیاہ لاتا ہوں
 کھڑا اک ایک پھر مکھڑا ہے
 سانجھ سے کھانے ہی کو دوڑا ہے
 ایک چٹکی میں ایک چھنگلی پر
 ایک انگوٹھا دکھا دے اُنکلی پر
 گرچہ بہتوں کو میں مسل سارا
 پر مجھ کھٹمنوں نے مل سارا

میتے راتوں کو گیس گئیں پوریں
ناخنوں کی ہڈیں لال سب کوریں

ہاتھ تکیے پہ کہ بچھونے پر

کدو چادر کے کونے کونے پر

سلسلایا جو پائینٹی کے اور

وہیں مسلا کر ایڑیوں کا زور

نوشک ان رگڑوں ہی میں سب پھارتی

ایڑیاں یوں رگڑتے ہی گاتی

جھارتے جھارتے گیا سب بان

ساری کیا آؤں کی چولیں نکالیں ندان

نہ کھٹولا نہ کھات سونے کو

پائے پتی لگائے کونے کو

جب نہ تب پندے پر لیے پائے

سیتلا کے سے دانے مرجھائے

سوئے تھا نہ بان میں کھٹمل

آنکھ، منہ، ناک کان میں کھٹمل

کہیں پھوٹا کہ جھسی تاب گئی

آنکھ سے تا پگاہ خواب گئی

اٹھیلی پہ ایک گھاٹی میں

سیکڑوں ایک چارپائی میں

ہاتھ کو چین ہو تو کچھ کہے

کب تلک یوں تھولتے رہے

یہ جو بارش ہوئی تو آخر کار

اس میں سی سالہ وہ گری دیوار

آہ کھینچی خرابی کیا کیا نہ

تھ جو ہمسائے وہ ہیں ہمسخانہ

ایسے ہوتے ہیں گھر میں تو بیٹے

جیسے ستم میوہ کوئے ہو بیٹے

دو طرف سے تھا کتوں کا دستا

کاش جنگل میں جا کے میں دستا

شو گھڑی دو گھڑی تو دنگاروں

ایک دو کتے ہوں تو میں ماروں

چار جاتے ہیں چار آتے ہیں

چار عف عف سے مغز کھاتے ہیں

کس کہتا پھوں یہ صحبت نغو

کتوں کا سا کہاں سے لاؤں مغز

وہ جو ایوان تھا حجرے کے آگے

اس کے اجزا بکھرنے سب لاگ

کو تھا بوجھل ہوا تھا بیتھہ گیا

یانی جز میں اُس کے بیتھہ گیا

کڑی تختہ ہر ایک چھوٹ پڑا

ناگہاں آسمان قوت پڑا

میں تو حیران کار تھا اپنا

کوئی اس دم نہ یار تھا اپنا

انیت پتھر تھے متی تھی یکسر

خاک میں مل گیا تھا گھر کا گھر

چرخ کی کجروی نے پیسا تھا

پر خدا میرا سچہ سے سیدھا تھا

کتنے اک لوگ اس طرف دھاے

یا ملک آسمان سے آے

متی لے لے گئے وہ ہاتھوں میں

کام نے شکل؟ پکڑی باتوں میں

صورت اس لڑکے کی نظر آئی

ہم جو مرتے تھے جان سی آئی

آنکھ کھولی ادھر ادھر دیکھا

اس خرابی کو بھر نظر دیکھا

قدرتِ حق دکھائی دی آکر
 یعنی نکلا درست وہ گوہر
 داشت کی کوٹھری میں لار کیا
 کبر کا غم طاق پر اُٹھا رکھا
 مومبائی کیلائی کچھیلے جلدی
 فرصت اس کو خدانے دی جلدی
 غم ہوا سن کے دوست داروں کو
 پھر بددعا یہ خیال پیاروں کو
 کہ مری ہو و باش یاں نہ رہے
 گو تصوف میں یہ مکمل نہ رہے
 شہر میں جا بہم نہ پہنچتی کہیں
 چار و ناچار پھر رہا میں وہیں
 اب وہی گھر ہے بے سر و سایہ
 اُذر میں ہوں وہی فرو سایہ
 دن کو ہے دھوپ رات کو ہے اوس
 خواب راحت ہے یاں سے سو سو کوس
 قصہ کوتاہ دن اپنے کھوتا ہوں
 رات کے وقت گھر میں ہوتا ہوں
 نہ اثرِ بام کا نہ کچھہ در کا
 کھر ہے گاہے کا نام ہے گھر کا

—:O:—

در ہجو خانہٴ خون کہ بسبب شدت بارانِ خواب شدہ بون

جسم خاکی میں جس طرح جاں ہے
 اس طرح خانہ ہم پہ زنداں ہے
 ظلمتیں اس کی سب پہ روشن ہیں
 زندہ درگور ہم کئی تن ہیں

ہے جو سر کوپ اک بڑی دیوار
 واں سے جھانکو تو ہے اندھیرا غار
 بخت بد دیکھتے سارے پر نالے
 اس کے معمار نے ادھر تھالے
 اب جو آیا ہے موسم برسات
 دن کو ہے اپنے ہاں اندھیری رات
 صحن میں آب نیڑہ بالا ہے
 کوچہ موج ہے کہ نالا ہے
 سینہ میں گھر کے پانچ چہہ چہر
 ہم غریبوں کے ہوتے ہیں سر پر
 پر نلک نلکے تھے کچھہ ایک نئے
 سووے چڑیوں کے گھونسلوں کو گئے
 دل ہے کچھہ مکاریوں کا احساس مند
 کہ جنہوں نے کیے ہیں جھانکے بند
 ہوس کچھہ ہے کہیں سو آقا ہے
 بانس کو جھینگروں نے چاتا ہے
 آر گئی گھانسی مٹی ہے والا
 ہے جو بندھن سو مکاری کا جالا
 اپنے بندھن سے جو کہ چھوٹا ہے
 ہم یہ گویا وہ بانس توتا ہے
 کیا کہوں آہ گھر ہے کہنے کو
 باندھتا ہوں سچان رھنے کو
 بند جھانکوں کو کیجیے تاکے
 یان تو یک آسمان توتا ہے
 تھیکے دینے کو جا آئے ہیں ہم
 سر پہ تھتھر لیے کھڑے ہیں ہم
 تھیاں تھیں جو آگے چہر کے
 بہتی پھرتی ہیں صحن میں گھر کے

ناگلے سب کھڑے ہیں پانی میں
 خاک ہے ایسی زندگانی میں
 اب تو اپنا بھی حال بدتر ہے
 سر پہ گتھری ہے نسیبہ چھپر ہے
 پانی بہ کر جھکا جو ہے دال
 سر پہ رہتا ہے طرہ ایوان
 چاک اس قوئل سے ہے ہر دیوار
 جیسی چھاتی ہو عاشقوں کی فگار
 متصل تپکے ہے نہ باران ہے
 گریہ زار سرگوداں ہے
 گھر کی صورت جو اور ہوتی ہے
 چھت بھی ہے اختیار رونی ہے
 مہنہ یکبارگی جو ٹوٹ پڑا
 کڑی تختہ ہر ایک چھوٹ پڑا
 دایے پامان کار ٹوٹ رہے
 طاقچے بھر رہے تھے بھرت رہے
 بہ گئے گولے تختے قوئل گئے
 فرض اجزائے سقف خوب گئے
 موج خشتی ستون میں پیٹھی
 جان فمناک خون میں بیٹھی
 لے گیا پیچ و تاب پانی کا
 کوٹھری تھی حباب پانی کا
 میں دھا گھر کہ بار خاطر تھا
 آہ کس کا غبار خاطر تھا
 اکھڑی دھلیز سب منتدیر گری
 لہری پانی کی جہازو دیتی پھری
 ساری بنیاد پانی نے کاٹی
 ایست کے گھر کو کر دیا ماتی

جھک گئے سب ستون درہ بیتھا۔

وہی چھیر کھڑا ہے گھبراہٹ میں بیتھا۔

جب اجاڑے پہ آکے چہمت تھیری

ہم سبھوں میں یہ مصلحت تھیری

آؤ اب چھوڑ کر یہ گھر نکلیں

کسو تقی پہ بیتھ کر نکلیں

دب کے مرنے سے قوب مرنا خوب

ہے گذار یہاں سے کرنا خوب

سنکے ہر اک کے جی میں در آیا

خاطروں میں یہ حرف تھیرا یا

گتھڑی کیڑوں کی میں اٹھائی تھی

سریہ بھائی کے چار پائی تھی

بوجھ کیڑوں کا جن نے باندھا تھا

اس کا سارا فکارا کاندھا تھا

ساتھ کوئی چراغ لے نکلا

کوئی سرپ اُج-ا-غ لے نہ نکلا

چھاج کی کو کے کوئی لپٹ چلا

مینہ کے مارے کوئی لپٹ چلا

منہ پہ چھلنی کو ایک نے رو پنا

ایک نے سر کی کا کیا گھو پنا

ایک نے چھینکے حال لیے

پائے پتی گلے میں ڈال لیے

ایک نے بوریا لپیٹ لیا

اور پایا جو کچھ سمیٹ لیا

اپنا اسباب گھر سے ہم لے کر

الگنی سب کے ہاتھ میں دیکر

صرف کی صف نکلی اس خرابی سے

تیا کہ پہنچیں کہیں شتابی سے

میر جی اس طرح سے آتے ہیں
 جیسے کنجیر کہیں کو جاتے ہیں
 جن نے اُس وقت آنکھ کو کھولا
 ہنس کے بے اختیار وہ بولا
 سنا کہ اس بات کو تو آئے ہم
 بارے اک بھائی کے گھر آئے ہم
 تب سے دھڑے کو اب تلک ہیں خراب
 نہیں ملتا ہے گھر بقدار حباب
 جس میں خوش یک نفس معاش کریں
 طور پہ اپنے بود و باش کریں

جوش عشق

ضبط کروں میں کب تک آہ اب
 چل اے خامے بسم اللہ اب
 کمر تک دل کا راز نہ پھانی
 ثبت، جریدہ میہری زبان
 یعنی میو ایک خستہ غم تھا
 سر تا پا اندوہ والم تھا
 آنکھ لٹی اس بٹی اک جاگہ
 بے خود ہو گئی جاہان آگاہ
 صبر نے چاہی دل سے رخصت
 تاب نے دھونڈی یکدم فرصت
 تاب و توان و شکیب و تحمیل
 رخصت اُس سے ہو گئے بالکل
 سہنہ فکاری سامنے آئی
 بیتابی نے طاقت پائی

*فارسی متاوردہ ترجمہ کا ترجمہ ہے یعنی شرمندہ ہونا۔

کرتے آئے داغ سیاہی
 کام جگر کا کرنے تباہی
 خوں جگر ہو بہنے لاک
 پلکوں ہی پر رہنے لاک
 خواب و خورش کچھہ کام نہ آیا
 ایک گھڑی آرام نہ آیا
 چاک جگر سے مصیبت ٹپکی
 آنسوں کی جاگہ حسرت ٹپکی
 سوز سے چھا تی تابہ گویا
 ایک پلک خونما بہ گویا
 آہ سے اُس کی مشکل جھینا
 درد فقط تھا سارا سینا
 دل میں تننا داغ جگر میں
 شیوں لب پر یاس نظرمیں
 نالے شب کو اُس کے سنکر
 سرگئے کتنے سر کو دھن کر
 آہ و فغاں ہے اُس کے لب پر
 روز نئی * ایک آفت شب پر
 روے و جبین پہ خواش ناخن
 داغوں سے خوں کے قامت گلبن
 زخم سینہ دل تک پہنچا
 کوئی نہ اُس گھائل تک پہنچا
 آبلہ دل کا جب کوئی پھوٹا
 فوارہ لو ہو کا چھوٹا
 غم نے تو دل میں کیا ہے چھوڑا
 بر میں تھا اک پکا پھوڑا

* کلیات میر مطبوعہ مطبع مذہبی نولکشور کانپور میں یہ مصرع
 اس طرح لکھا ہے 'روز نئی اک آفت صب پر —

ہونا گیا اک دم وہ بے نل
 بخت نہ جائے اس کے ک پل
 کام دھا ناگامی ہی سے
 تسکین ہے آرامی ہی سے
 رخساروں پر خون رواں ہو
 دل میں ہو سو منہ پہ عیاں ہو
 دشت غم سے سینے کو کو چا
 ناخن سے منہ سارا نوچا
 دل آما جگہ غمناکی
 اور نفس اک تیر خاکی
 نے طاقت نے یارا اُس کو
 ضعف دلی نے مارا اُس کو
 نالہ دل میں حزینی اُس کی
 خاطر میں غمگینی اُس کی
 رنگ آئے چہرے کا ہر دم
 تھا گویا گل آخر موسم
 دست بدل ہر آن دھ وہ
 بے طاقت ہے جان دھ وہ
 رنگ شکستہ بسکہ فسرده
 کہنے کو زندہ لیکن مردہ
 خونباری سے چہرہ گلگون
 حلق بسل دیدہ پر خوں
 جمدول جاری چاک گریباں
 گوشہ دامن وقف مڑگان
 دیدہ تر کے دریا قابل
 ساحل خشک لپی کے سائل
 ہر دم ہو ہر سست کو جاری
 خونباری سے سیل بہاری

تشنہ لہی اک منہ پر پیدا
 لب چش جس کا ہووے نہ دریا
 خاک بسر آشفته سری سے
 شور قیامت نوحہ گری سے
 سر تا پا آشفته دماغی
 داغ جنوں دے جس کو چراغی
 غم سے گرچہ دم بھی کہیں نہا
 جامے میں اک تار نہیں تھا
 وادی پر جب اپنی آوے
 صحرا صحرا خاک آزاوے
 کلفت دل جب خاک فشاں ہو
 اشک کی جاگہ ریگ رواں ہو
 گل اُن نے از بسکہ کھائے
 پھولوں کی چھریاں ہاتھ بنائے
 دل کے غبار نے راہ جو پائی
 شہر میں گویا آندھی آئی
 سر پر اس کے سنگ ہمیشہ
 جی پر عرصہ تنگ ہمیشہ
 آہ سرد کرے وہ عریاں
 بید سا کانپے موئے پریشاں
 گرد کی تہ اس کا پیراھن
 دامن صحرا جس کا دامن
 بار دامن تار گریباں
 دامن قرب و جوار گریباں
 پامالی میں مثل جادہ
 نقش قدم سا خاک افتادہ
 دشت تلک گئی آبلہ پائی
 دور کھنچی اس کی رسوائی

اُس کے جو پامال ہوئے سب
 خار بیاباں لال ہوئے سب
 جن نے دیکھا اُس کو ایک دم
 اُن نے کہا یہ بھول کے سب غم
 چندے یہ ناشاد رہے گا
 پر مدت تک یاد رہے گا

جلنا اس سے کرے نہ کنار
 جیسے چہراغ وقف بچار
 لو ہو تپکے آہ سحر سے
 نالہ گتھیواں لخت جگر سے
 رکھتا سدا تھا وہ دیوانہ
 ورد زباں یہ شعر دانا ق
 صار فوادی شقا شقا
 حقا حقا حقا حقا

ہوش و خرد ناشاد گئے سب
 دین و دل برباد گئے سب
 درد دل سے کچھ نہ کہے وہ
 ہر اک کا منہ دیکھ رہے وہ

حسرت اس کی ایک اعجوبہ
 آب دھن کی موج میں ڈوبا
 غیور سے بولے نہ یاروں ہی سے
 بات کہے تو اشاروں ہی سے

سمجھو تو کوئی داد کو پہنچو
 عاشق کی فریاد کو پہنچو

ورنہ رہے سن مار کر اپنا
 سر دے مارے ہار کر اپنا

کیونکر غم سے ہو آزادی
 جان کے ساتھ اُس کی ناشادی

کوئی نہ اُس پر سایہ گستر
 اپنا ہاتھ اپنے ہی سر پر
 نے کعبہ نے دیہ کے قابل
 مذہب اُس کا سیر کے قابل
 کیسا کہیے کیسا کچھ تھا
 القصہ وہ ایسا کچھ تھا

—:○:—

دنیا

سنو اے عزیزان ذی ہوش و عقل
 کہ اس کارواں گم سے کرنا ہے نقل
 پیسہ ہے شہ ہے کہ درویش ہے
 سبہوں کو بھی راہ درویش ہے
 کہو گے کہ آئے تھا کہتا کرئی
 نہیں اُس سرا بھیج رہتا کرئی
 بجائے نہی کیا کوس رحلت مدام
 کنہوں نے نہ بجتا سناہاں مقام
 یہ بیٹھ جو عین سامنے ہیں کہاں
 جہاں جسلہ ہے ایک بزم رواں
 جسے دیکھو چلنے کا گرم تلاش
 یہ منزل نہیں جائے بود اور باہ
 گدا ہو کہ ہو شاہ عالی تبار
 تہ خاک سب کا ہے دارالقرار
 نہ یک بوئے خوش ہی ہوا ہو گئی
 وہ رنگینی باغ کیا ہو گئی
 ملے خاک میں جھوٹے گلہائے تر
 پیدشاں ہوئے مرغ گلشن کے پر

پتنگوں نے گر خاک مسکن کیا
 چراغوں نے بھی خانہ روشن کیا
 گئی خاک دامن فشانے کے ساتھ
 رہا آب سو بھی روانی کے ساتھ
 رہی راکھ ہو کر اگر آگ تھی
 رکن ہے جہاں باؤ کی لاگ تھی
 نہ جدواں رہے ، گئی نہ سرو رواں
 گلستان کو پارینگے ہو کا مسکن
 زمیں کا رہے گا یہیں کیا سبھاؤ
 لپٹ جائینگے آسمان جیسے ناؤ
 سکوں یاں کا دیکھا سراسر شتب
 چلے جاتے ہیں کوہ جیسے سحاب
 جہاں ایک ماتم سرا ہے عجب
 نہیں جائے باش اور جا ہے عجب
 بھلا جی کے جانے کا کیا ہے بیان
 عیاں ہے کہ کہتے ہیں جان کوروں
 جوانی گئی موسم شیب ہے
 شہود ایک دو روز کو غیب ہے
 ہڈیوں کیونکہ ہسٹنی میں دندان نما
 کہہ جائے دندان ہی دندان نما
 گیا شور سر سے جھکائے بہت
 گئی واہد اب دل دکا ہے بہت
 نہ وہ ذائقہ ہے نہ وہ ہے مشام
 سرا کچھ نہیں ہو چکی صبح شام
 بلا ارتعاش تن زار ہے
 ہر ایک عضو چلنے کو تیار ہے
 ہوا حافظہ بسکہ نسیاں کا صرف
 نہیں یاد آتا ہے دوشینہ حرف

ہوئے شعر کیا کیا فراموش ہائے

کہوں کیا گزرتی ہے خاموش ہائے

نہ پوچھو لب ولہجہ بے طور ہے

سخن کرنے کا دھنگ ہی اور ہے

نہیں کور کے کام سے کچھ فراغ

کسے ذوق صحبت کہاں ہے دماغ

نہ کچھ یوں ہی عینک نظر چڑھ گئی

بصارت کی ہے طاقتی بڑھ گئی

نہ رکھیے جو عینک نہ آوے نظر

کہے تو کہ افسیٰ ہیں ہم بے بصر

رہیں دیکھہ جو حرف زن ہو حریف

رہا سننے کی گوں نہ سمع شریف

صد افسوس نطف سماع نہیں

صدا دور سے جیسے آوے کہیں

شب اب آہ داغ جگر دے گیا

قدخم زمیں کی طرف لے گیا

نہ کچھ زور بازو بہت کم ہوا

جھکا سر سوزانہ کا ہمدم ہوا

جوانی کی شب کیا بسر ہو گئی

سفیدی سو سے سخن ہو گئی

بدن زار اعضا سبھی ریشہ دار

گرے کون خوباں سے بوس و کفار

جو یہ چال ہے جا رہے ہیں ہم اب

دسوں پر غرض آ رہے ہیں ہم اب

کھڑے ہوں تو تھرائے دان اور ساق

جیہیں بیٹھیں کیونکر کہ جینا ہے شاق

جو یوں پاؤں چلتے بچلتے رہے

تو دیکھو گے ہم یاں سے چلتے رہے

اگر ضعف سے چپ بھی رہتے ہیں ہم
 یہ سوچو تو کیا کیا نہ کہتے ہیں ہم
 کہیں نہیں نہیں اپنے ٹک پاؤ دست
 کیا خاک میں مجھ کو پیروی نے دست
 جو بازو نہیں اپنے سو بازو نہیں
 اگر منہ کو دیکھو تو وہ رو نہیں
 بدن کی ہوئی میرے صورت ہی اور
 وہ آنکھیں نہیں وہ نہ چتوں کے طور
 جسد ناتواں جائے مہمان تنگ
 سخن منہ پہ آوے وداعی کے رنگ
 لبوں پر لہایت ضعیف ایک آہ
 در و بام پر حسرتوں سے نگاہ
 شکن جلد میں دل کو پڑسردگی
 غریزی حرارت میں افسردگی
 برودت بہت جسم میں آگئی
 مزاجی نہیں گرمی سو تھتھرا گئی
 چہرہ کتا رہوں منہ پہ میں آب کاش
 کہ ہونا رہے روح کا انتعاش
 وگرنہ دیا سا بجھا جائے
 پھر اُٹھ بیٹھوں تو جی چلا جائے
 سینہ روے شیب اک ستم کر گیا
 لکھوں کیا کہ میں جیتے جی مر گیا
 قلم رکھ دے کر میر ختم کلام
 نسام اپنی صحبت ہوئی والسلام

مناجات بطور عاشقان زار در بلاے جدائی گرفتار

مرا زخم یا رب نمایاں رہے
 پس از مرگ صد سال خنداں رہے
 رہے دشمنی جیب سے چاک کو
 صبا دوست رکھے سری خاک کو
 مژہ اشک خونیں سے سازش کرے
 غم دل بھی مجھے پرو نوازش کرے
 جگر سے تپیدن موافق رہے
 مرا درد دل مجھے یہ عاشق رہے
 جو نالہ ہو شہگیر کا روشناس
 وہ آتھوں پہر ہی رہے میرے پاس
 مژہ گرم افسوس نیناک ہو
 کہ سیلاب آتش پہ خاشاک ہو
 کرے نیزہ بازی یہ آہ سحر
 کہ خورشید کی پھوٹ جائے سپر
 خموشی سے مجھکو رہے گفتگو
 اُڑے پر لگا کر مرا رنگ رو
 نہ مرہم سے افسردہ ہو داغ دل
 شگفتہ رہے یہ دل باغ دل
 سدا چشم حیرت سے نسبت رہے
 مجھے دیکھ رہے کی فرصت رہے
 اگر ضعف تک کسب طاقت کرے
 سری ناتوانی قیامت کرے
 سری بیکسی ناز بردار ہو
 مروں میں تو سرے کو تیار ہو

بیابان میں آشفتمہ حالی کروں
 کہیں تو دل پر کو خالی کروں
 کریں درو عالم سلامت مجھے
 تہود یوں اشک ندامت مجھے
 مرا ہاتھ ہو چاک کا دستیار
 کہ تا جیب و دامن ہوں قرب و جوار
 جنوں مجھے سر پر سلامت رہے
 بیابان میں مجھے سے قیامت رہے
 بہکنے سے مجھے کو نہ ہو وار ہی
 بھلا دے خضر کو مری گم رہی
 جو ہو گرم رہے پائے پر آبلہ
 تو ہو جائے سرد آتش قافلہ
 ارے ساقی اے غیبت آفتاب
 کہاں تک ہسین خون دل کی شراب
 کچھو ساغر و بادہ کا دید ہو
 محکرم ہمارا کبھی عیو — د ہو

—: ۰ :—

در تعریف عشق خانماں آباد و آزادگان

بر نازنہاں

زہر عشق نیرنگ سازی تری
 کہ ہے کھیلنا جی پہ بازی تری
 تجھی سے ہے یہ اب رخ زرد زرد
 تجھی سے مرے دل میں اُٹھتا ہے درد
 تجھے ربط کفار و دیندار سے
 تجھے رشتہ تسبیح و زناں سے

تجہی سے ہے بلبل کی نوحہ گری

تجہی پر ہے قسری بھی خاکستری

ترا جذب دریا کو بہتے نہ دے

ترا شور صحرَا کو دھلے نہ دے

تجہی سے دل شاد غمناک ہے

تجہی سے مرا سینہ صد چاک ہے

تمنا کو تو نے کیا ہے شہید

تجہی سے نہ ہو آئی میری امید

تجہی سے ہے مجنون صحرَا نورِ

تجہی سے ہے فرہاد کوہوں پہ مرد

تجہی سے گلوبند ہے خستگی

تجہی سے ہے وابستہ دلبستگی

تجہی سے دل عاشقان ہے کباب

تجہی سے ہے پروانہ آتش کا باب

ترا کام دینا ہے بدنامیاں

تری ریت پہ دیکھ نہیں لگا سیاں

تجہی سے سرا سیمہ ہیں یارِ لوگ

تری تیغ سے تھکے ہیں یارِ لوگ

تجہی میں ہیں یہ کارِ رشا زیاں

تجہی پر ہیں مرقوق جانبا زیاں

سجھ اس کے چیلے کا سودا دھا

ولیکن ترا راز رسوا دھا

لہو اپنا عاشق پیمانے کے

ترے جسم پر جی دیا ہی کے

ترا ہی نیک خوار ہے زخمِ دل

کہ مرہم سے بیزار ہے زخمِ دل

تجہ اک ہے مژگن سے یہ ربطِ اشک

کہ مشکل ہوا ہے مجھے ضبطِ اشک

کدھر ہے تو اے ساقی لالہ قام
نہ لغزش ہے تجھ سے نہ بہکا کلام

کہاں تک کوئی خون دل کو پیسے
کوئی کیونکہ اس رنگ ظالم جیسے

— 10 —

خوابِ دل

خوش حال اس کا جو معدوم ہے
خوش حال ایسا تو معلوم ہے
رخصتِ زمانِ غمزدک کو کاشیں
کٹیں دل سے تو سید سو خواہشیں

زمانے نے رکھا مجھے متصل
پراگندہ روزی پراگندہ دل
گئی کب پریشانی روزگار
رہا میں تو ہم طالعِ زلف یار

وطن میں نہ اب صبح میں شام کی
نہ پہنچی خبر مجھ کو آرام کی
اُتھاتے ہی سر یہ پڑا اتفاق
کہ دشمن ہوئے سارے اہلِ وفاق
جلاتے تھے مجھے پڑ جو اپنا دماغ
دکھانے لگے داغِ بالائے داغ

جدائی نے آوارہ چاہا مجھے
مزی بیکسی نے نبھا مجھے

رفیقوں سے دیکھی بہت کوتاہی
غریبی نے اک عمر کی ہمسری
مجھے یہ زمانہ جدھر لے گیا
غریبانہ چندے بسر لے گیا

بندھا اس طرح آہ بار سفر
کہ نہ زاد رہ کچھ نہ یار سفر

دل اک یار سرے قرار بتاں
غبار سر رہ گزار بتاں
گرفتار رنج و مصیبت رہا
غریب دیار محبت رہا

چلا اکبر آباد سے جس گھڑی
درو بام پر چشم حسرت پڑی
کہ ترک وطن پہلے کیونکر کروں
مگر ہر قدم دل کو پتھر کروں

دل مضطرب اشک حسرت ہوا
جگر رخصت آنے میں رخصت ہوا
کھچا سارے رہ دامن چاک دل
رہا ہر قفا روے غمناک دل

پس از قطع رہ لائے دلی میں بخت
بہت کھینچے یاں میں نے آزار سخت
جگر چور گردوں سے خوں ہو گیا
مجھے رکتے رکتے جنوں ہو گیا

ہوا خبط سے مجھے کو ربط تمام
لگی رہنے صحبت مجھے صبح و شام
کبھو کف بلب مست رہنے لگا
کبھو سنگ دردست رہنے لگا

کبھو غرق بحر تصویر رہوں
کبھو سر بجیب تفکر رہوں
یہ وہم غلط کاریاں تک کھنچا
کہ کار جنوں آسمان تک کھنچا

نظرِ رات کو چاند پر گر پڑی
تو گویا کہ بجلی سے دل پر پڑی

مہ چار دہ گار آتش کرے
 دروں یاں تلک میں کہ جی غش کرے
 تو ہم کا بیٹھا جو نقش درست
 لگی ہوئے وسواس سے جان سست
 نظر آئی اک شکل مہتاب میں
 کسی آئی جس سے خور و خوب میں
 اگر چند پرتو سے مہ کے دروں
 ولیکن نظر اُس طرف ہی کروں
 دروں دیکھہ مائل اُسے اس طرف
 بحدے کہ آجائیں ہوٹوں پہ کف
 بڑی فکر جاں میرے احباب کو
 آزا دیویں سب گھر کے اسباب کو
 کوئی پاس کوئی نفاہت سے ہو
 سرسیمہ کوئی محبت سے ہو
 کوئی فرط اندوہ سے گریہ ناک
 گریباں کسو کا مرے غم سے چاک
 جو دیکھوں تو آنکھوں سے لوہو بہے
 نہ دیکھوں تو جی پر قیامت رہے
 کہے چشم بندی کو ہر بار غیو
 لے منزل دل میں اس مہ کی سیر
 وہی جلوہ ہر آن کے ساتھ تھا
 تصور مری جان کے ساتھ تھا
 اگر ہوش میں ہوں وگر بے خبر
 وہ صورت رہے میرے پیش نظر
 اُسے دیکھوں جیدھر کروں میں نگہ
 وہی ایک صورت ہزاروں جگہ
 نگہ گردش چشم سے فغذہ ساز
 مہ آفت روزگار دراز

عجب رنگ پر سطح رخسار کا
 مگر تھا وہ آئینہ گلزار کا
 جو آنکھ اُس کی بھٹی سے جا کر لپڑے
 دم توفع پر راہ چلنی پڑے
 مکان کنچ لب خواہش جان کا
 تبسم سب کا ہش جان کا
 دھن دیکھ کر کچھ نہ کہیے کہ آہ
 سخن کی نکلتی تھی مشکل سے راہ
 سزا ہے جگر اس کس کے لئے
 جو سیب ذقن اس کا بو کر چٹے
 گل تارہ شرمندہ اس رو سے ہو
 خچل مشکناں اُس کے گیسو سے ہو
 سراپا میں جس جانظر کیجیے
 وہیں صبر اپنی بسر کیجیے
 کہیں مہ کا آئینہ دردست ہے
 کہیں بادۂ حسن سے مست ہے
 کہیں نقش دیوار دیکھا ہے
 کہیں گرم رفتار دیکھا ہے
 کہیں دلیری اس کو در پیش ہے
 کہیں مائیل خوبی خویش ہے
 کہیں جملہ تن مہر حرف سلوک
 کہیں متجہ سے سر گرم حرف سلوک
 لطافت سے یکجان ہوئے تمیز
 سبک سیر مانند عمر عزیز
 کہیں جلوۂ پرداز وہ عشوۂ ساز
 کہیں ایستادہ بصد رنگ ناز
 ہر اک جائے لے ناز سے وہ مدق
 در و بام تصویر کا سا دوق

رہے سامنے اک طرح پر کبھو

رکھے وضع سے پاؤں باہر کبھو

کبھو صورت دل کش اپنی دکھائے

کبھو اپنے بالوں میں منہ کو چھپائے

کبھو گرم کینہ کبھو مہربان

کبھو دوست نکلے کبھو خصم جان

کبھو یک بیک یار ہو جائے وہ

کبھو دست بردار ہو جائے وہ

گلے میں مرے ہاتھ ڈالے کبھو

طرح دشمنی کی نکالے کبھو

کبھو چین برابر و کبھو ہڈی کے بات

کبھو بے وفائی کبھو التفات

جو میں ہا تھہ ڈالوں تو وہاں کچھ نہیں

بجز شکل وہی عیاں کچھ نہیں

ہر اک رات چندے یہ صورت دہی

اسی شکل و منی سے صفت دہی

نہ دم صبح ہو گرم رہ سوئے ماہ

کہ در پیش آوے یہ روز سیاہ

کہ جیو ما کروں ہیڈ مجنوں کی طرز

وہے یاد اس سرو سوزوں کی طرز

رہوں زرد میں گاہ بیمار سیا

پریشان سخن کہ پریدار سیا

پتی خواں کو لا کوئی افسوں پرشائے

کسو سے کوئی جا کے تعویذ لائے

طہیبوں کو آخر دکھایا مجھے

نہ پینڈ تھا جو کچھ پلایا مجھے

دوا جو لکھی سو خلاف مزاج

کھچا اس خرابی کو کار علاج

کہ سرِ رشتہ تدبیر کا گم ہوا
 دل اوپر ہجوم توہم ہوا
 دروں خود بخود بے حواسی رہی
 پریشان دلی اور اداسی رہی

کروں بے کئی جاؤں تا ہر کہیں
 نہ گھر میں لگے جی نہ باہر کہیں
 قیامت جنوں کا رہے سر میں شور
 کھچا جائے دل کو ہو صحرا کی اور

رہے شوق سر در گریبان دل
 ہوا کھینچے صحرا کو دامن دل
 سر آشفته زلف گرہ گیر کا
 قدم حلقہ در گوش زنجیر کا

جنوں آہ درپے ہوا جان کے
 مجوز ہوئے یار زندان کے
 کیا بند اک کوٹھری میں مجھے
 کہ آتش جنوں کی مگر واں بجھے

لب نان اک بار دینے لگے
 دم آب دشوار دینے لگے
 کہاں علم کا کسب فرصت نہ آہ
 ہوا کا بھی واں گشت روزن کی راہ

نہ آوے کوئی تار سے میرے کئے
 کہ کیا جانیے کیسی صحبت بنے
 وہ آشفته سر ہوشندی سے دور
 نہیں رابطہ مقتضائے شعور

وہ حجرہ جو تھا گور سے تنگ تر
 در اُس کا نہ کھلتا تھا در و در پھر
 جو اُس میں کبھو میں سنبھل بیٹھتا
 تو باہر بھی اک دم نکل بیٹھتا

سر شام بیٹھا تھا میں ایک روز
اوقات نہ آئی تھی مجھ کو ہنوا

کہ یاروں نے ہر جستہ تدبیر کی
مرے خون میں کچھ نہ تقصیر کی
اگر چندے کھلے سے خون کم کہ
لیا لوہو اتنا کہ بے دم کہ

بڑی دیر تک خون جاری رہا
میں بے ہوش وہ رات ساری رہا
جگایا سکر مجھ کو اک شور سے
گھلی آنکھ میری بڑے زور سے
وہی دست فساد میں نیست

وہی رنگ صحبت کا پیش نظر
وہی لوہو لیلے کا ہنگامہ پھر
وہی تر لوہو میں سرا جامہ پھر
لگی نشتر ایسی کہ لہتی نہیں
جبے جیسے مڑگاں کسو کے کہیں

ہوا خرن سے دامن و جیب تر
رگ جاں تلک زخم پہونچا سگر
ٹپکتا رہا دیر تک خون ناپ
مجھ لے گئی بے خودی کی شراب

سخن ضعف سے سخت دشوار تھا
پلک کا اُٹھانا بھی اک بار تھا

کئی روز بالیں پہ یہ سر رہا
خمار ایک مدت تک پھر رہا
کھڑا ہوں اگہ پاؤں لغزاں رہ
بدن بید کی طرح لرزاں رہ

چلا جائے سر پاؤں تھر تھر کرے
نسیم سکر کار صرصر کرے

جنا ضعف سے مجھ کو کیا کیا نہ تھی

افاق تگمے یوں کہ گویا نہ تھی

پس از چند آنکھیں تھپرنے لگیں

نگاہیں بھی کچھ کام کرنے لگیں

بندھا ناتوانی کا رخت سبز

کیا طاقت رفتہ نے منہ اُدھر

کسے تھا مری زندگانی کا دھیان

لیکن نہایت تھامیں سخت جان

لگی جان سی آنے لٹا کے پیچ

کوئی روز رھنا تھا دنیا کے پیچ

پھر ناتواں میں بہت دور سے

کہ نزدیک تھا عالم گور سے

غلط کاری و ہم کچھ کم ہوئی

وہ صحبت جو رھتی تھی برہم ہوئی

وہ صورت کا تھا و ہم دیوانگی

لگی کرنے دو پردہ بیگانگی

پس از دیر آنکھوں میں آنے لگی

نہ دو دو پہر منہ لگانے لگی

نہ دیکھے مری اور اُس پیار سے

غریبانہ سر مارے دیوار سے

کہیں تک تسلی کہیں بے قرار

کہیں شوق سے میرے بے اختیار

کہیں واسطے میرے روتی ہے خون

کہیں دست زیر زنج ہے ستون

کہیں دل کو اپنے دکھاوے مجھ

مری بے وفائی جتاوے مجھ

کہیں دست پر دل وہ رشک قمر

کہیں حسرت آلودہ مجھ پر نظر

کہیں بے دماغانہ سو گوم ناز
 کہیں آتش شوق سے جاں گداز
 کہیں چشم گریاں سے دامان چاک
 کہیں سو جگہ سے گریبان چاک
 کہیں کام دل کی شکایت سے ہے
 کہیں نقش دیوار حیرت سے ہے
 کہیں مجھ سے کہتی ہے وخصمت مجھ
 کہ مطابق نہیں غم کی طاقت مجھ
 کہیں لب پہ وہ شکوہ خوں چکان
 کہ تھکا کرے جس سے آزار جان
 کہیں وہ نگہ جس سے یہ پائیے
 کہ یہ درد دل ہے تو مرجائیے
 کہیں وہ روش جس سے نکلے عتاب
 کہیں وہ طرح جس سے دھیسے خراب
 کہیں حرف زن اس طرح ناز سے
 کہ دیکھا گیا دل کس انداز سے
 کہیں وہ ادا جس سے معلوم ہو
 کہ جیسے وہ عاشق کہ محروم ہو
 کہیں وہ سخن جو جگر خوں کرے
 کہیں طرز ایسی کہ مفتوں کرے
 کہیں وضع ایسی کہ بیگانہ ہے
 کہیں آشنا ہے تو دیوانہ ہے
 کسو جا ہے جلوے میں اس آن سے
 کہے تو کہ بیزار ہے جان سے
 کسو وقت اس کا یہ اسلوب ہے
 کہ شرم محبت سے مستحرب ہے
 کہیں بے قراوی ہے اس رنگ سے
 کہ پھرتی ہے سرماسازی سنگ سے

دار
 یار

جھ
 جھ

Checked
1937

آ
مجھ
جوانی

بہت
ہم
آؤ

کہو بے ادائی و دشنام ہے
کہو باؤ کے ہانہ پیغام ہے
کہ اے بے وفا آہ دل نرم کر
محبت کے بھی منہ سے کچھ شرم کر
کہو وہ تختہ کہ پروا نہیں
کہو کیوں کہ کہیے کہ سودا نہیں
کہو یہ سخن جس سے ہو مستفاد
کہ اے بیوفا حرف میں یاد باد
کہ ظاہر میں میرا اب تو آ گیا
کہ وہ دوستی کا زمانہ گیا
خبر نہ نا امیدانہ کہ اک نگاہ
نقش تو ہم گیا سوے ما
نہ آیا کہو پھر نظر اس طرح
نہ دیکھا اُسے جلوہ گر اس طرح
مگر گاہ سایہ سا مہتاب میں
کہو وہم سا عالم خواب میں
دل خویش وصال دوام
رہے خواب میں روز و شب صبح و شام
اگر وصل خواب فراموش تھا
ولیکن وہی خواب کا جوش تھا
پلک سے پلک آشنا ہے وہی
ز خود رفتگی کی رداہی وہی
کہڑا ہوں تو سوتا ہوں اک ذوق میں
رگ خواب دل ہے کف شوق میں
جو بیٹھا ہوں خواب گراں ہے مجھ
وہ غفلت جہاں درجہاں ہے مجھ
خیال اس کا آوے کہ سن ہو رہوں
نلے سر کے پتھر دکھوں سو رہوں

مجھے آپ کو یہ نہیں کہوتے تھی

جوانی تمام اپنی سوتے تھی

دکھایا نہ اُس نے وہ خواب میں

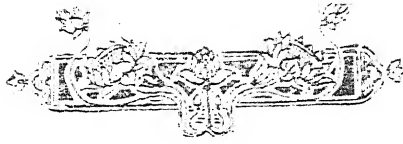
نہ دیکھا پھر اُس کو کبھی خواب میں

بہت بے خود و بے خبر ہو چکا

ہم آغوش طالع بہت سوچا

نہ دیکھا کبھی میر پھر وہ جمال

وہ حکمت نہی گویا کہ خواب و خیال



۱۷۳۵۱	
۲۵۱ ح	
	کتاب نمبر

نرم ک

د شرم کر

مستفاد

یاد باد

ک لکھ

م

ب میں

ہیں

ب تھا

تھا

وق میں

وق میں

نو رہوں

رہوں

Handwritten text in Urdu script at the top of the page, partially obscured by a stamp.



Checked
1937